وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

اور جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کیوں ہم پر فرشتے نہیں اتارے جاتے؟ یا (کیوں) ہم اپنے رب کو (نہیں) دیکھتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا اور بڑی بھاری سرکشی اختیار کی۔ (2363)

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَ يَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوش خبری نہیں ہوگی اور کہیں گے کوئی روک حائل ہو جائے۔ (2364)

وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

اور ہم اس کی طرف متوجہ ہوں گے جو انہوں نے عمل کیا ہوگا، سو ہم اسے اُڑتی ہوئی دھول کر دیں گے۔ (2365)

2363- ﴿فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ سے مراد [فِيْ شَأْنِ اَنْفُسِهِمْ] ہے۔ یعنی اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا۔ فرشتے کیوں نہیں اترتے؟ یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے؟ [دیکھو نمبر: 269] ان کا منشا صرف اتنا اعتراض نہیں کہ فرشتے یا اللہ تعالیٰ ان آنکھوں سے کیوں نظر نہیں آتے؟ بلکہ جیسا کہ اوپر کی آیت میں تَضْبِرُوْنَ سے ظاہر ہے مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچاتے تھے، پھر کہتے تھے محمد رسول اللہ ﷺ کی حمایت کے لیے فرشتے کیوں نہیں آتے یا خود خدا کیوں نہیں آتا؟ اسی کو استکبار اور سرکشی کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اپنے آپ کو اتنا بڑا خیال کرتے ہیں کہ سمجھتے ہیں ہم پر کبھی سزا ہی نہیں آئے گی۔ خود جواب سے بھی یہی ظاہر ہے جو اگلی آیت میں ہے۔

2364- ﴿حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾۔ حِجر کے معنی منع یا روک ہیں اور مَحْجُور روکا گیا۔ مفردات میں ہے کہ جب ایک شخص ایسے آدمی کے سامنے آتا جس سے وہ ڈرتا تو یہ لفظ بولتا۔ اور یہاں مراد یہ ہے کہ کافر فرشتوں کو دیکھ کر ایسا کہیں گے تاکہ وہ اس طرح سزا سے بچ جائیں۔ اور بعض نے اسے فرشتوں کا قول لے کر یوں معنی کیے ہیں کہ اچھی خبر آج تم پر حرام کر دی گئی ہے۔ اور یہی الفاظ ﴿حِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ آگے [آیت:53] میں ایسی روک کے متعلق آتے ہیں جو حائل ہو جائے۔ پس پہلے معنی ہی درست اور صحیح ہیں۔ یہاں ان کے مطالبہ سزا کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ فرشتوں کا نزول تو ان کی سزا کے لیے ہوگا اور اس دن وہ چاہیں گے کہ ان میں اور ان کی سزا میں کوئی حائل ہو جائے۔ مگر اس وقت شوخی کر کے جلدی کر رہے ہیں۔

2365- ﴿هَبَآءً﴾۔ [هَبَآءُ الْغُبَارُ] کے معنی ہیں غبار اُٹھا اور چڑھ گیا۔ اور هَبَآءً باریک مٹی کو کہتے ہیں اور جو ہوا میں ذرات

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾	جنت والوں کا اس دن اچھا ٹھکانا ہوگا اور بہت خوب استراحت کی جگہ ہوگی۔ (2366)
وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾	اور جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے۔ (2367)
اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾	حقیقی بادشاہت اس دن رحمٰن کے لیے ہوگی اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔ (2368)

اُڑتے ہیں اور سورج کی روشنی کمرہ میں کسی سوراخ سے پڑے تو نظر آتے ہیں۔ ﴿فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا﴾ [الواقعة: 6:56] ''پس وہ اُڑتا ہوا غبار ہو جائیں گے۔'' (غ)

مَّنْثُوْرًا۔ نَثر کے معنی ہیں ایک چیز کو پھیلا دینا اور اسے پراگندہ کر دینا۔ ﴿وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝﴾ [الانفطار: 2:82] ''اور ستارے پھیل جائیں گے۔''

یہاں عمل سے مراد جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے ان کا وہ عمل ہے جو مخالفت حق میں انہوں نے کیا۔

2366- مَقِيْل۔ [قِلتُ قَيْلُولَةً] کے معنی ہیں دوپہر کے وقت سویا اور مَقِيْل اس سے مصدر بھی ہوسکتا ہے اور قیلولہ کا مکان بھی مراد ہوسکتا ہے۔ (غ) اور قَيْلُولَةً یا مَقِيْل اہل عرب کے نزدیک دوپہر کے وقت محض استراحت کا نام ہے۔ گو اس کے ساتھ نیند نہ ہو۔ (ل)

2367- تَشَقَّقُ اصل میں تَتَشَقَّقُ ہے اور [شَقَّ الْفَجْرَ] اور اِنْشَقَّ صبح کے طلوع پر بولا جاتا ہے۔ (ل) اور آسمان کے بادل سے پھٹ پڑنے سے مراد بارش کا اترنا ہی ہوسکتا ہے۔

یوم الفرقان: اس میں جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بارش کا نازل ہونا اور فرشتوں کا نزول دونوں اس جنگ میں ہوئے، اور بدر کو یوم الفرقان بھی کہا ہے۔ ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ [الأنفال: 41:8] ''فرق کرنے کے دن، جس دن دو گروہوں میں مڈھ بھیڑ ہوئی۔'' اور گو مفسرین اس کو قیامت پر لگاتے ہیں لیکن آگے [آیت:27] میں اور اس کے بعد جہاں ظالم کے ہاتھ کاٹنے کا اور کسی کو دوست بنانے وغیرہ کا ذکر ہے وہاں مراد جنگ بدر کا ہی ایک واقعہ لیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے یہ آیات جنگ بدر کے متعلق ہی ہیں جو مکذبوں کے لیے یوم فرقان تھی۔ کیونکہ اس دن ان کی طاقت توڑ دی گئی۔

2368- رحمٰن کی بادشاہت تو ہر وقت ہی ہے، وہ مالک الملک ہے جس سے چاہتا ہے ملک لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ پس یہاں

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾

اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ کاٹے گا، کہے گا اے کاش! میں نے رسول کے ساتھ رستہ اختیار کیا ہوتا۔ (2369)

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾

مجھ پر افسوس! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

اس نے مجھے ذکر سے بہکا دیا، اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ گیا تھا اور شیطان (آخر) انسان کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

اور رسول نے کہا اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز (کی طرح) قرار دیا۔ (2370)

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے اور تیرا رب ہدایت دینے والا اور مدد دینے والا کافی ہے۔

مراد رحمٰن کے بندے ہیں ﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ﴾ جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور اس میں اشارہ بدر میں مسلمانوں کے غلبہ کی طرف اور کفار کی ہزیمت کی طرف ہے۔ اس لیے ﴿عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا﴾ بھی اس دن کے متعلق فرمایا۔

2369- ﴿يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ﴾۔ عَضّ کے لیے [دیکھو نمبر: 506] اور ہاتھ کاٹنے سے مراد اظہار ندامت ہے۔ کیونکہ ندامت کے وقت لوگ ایسا کرتے ہیں۔ (غ)۔ ابن جریر میں ہے [نَدْمًا وَّاَسَفًا]۔

مفسرین نے یہاں ظالم سے مراد عقبہ بن ابی معیط کو لیا ہے۔ اور اگلی آیت میں فُلَانًا سے مراد ابی بن خلف ہے۔ (ج۔د) اور یہ واقعہ لکھا ہے کہ عقبہ جو اُبی بن خلف کے کہنے پر رسول اللہ ﷺ کے منہ پر تھوکنے کے لیے تیار ہو گیا تھا بدر کے دن قیدیوں میں پکڑا گیا اور قتل کیا گیا۔ اور یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور کئی اوروں سے روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیات جنگ بدر کے ہی متعلق ہیں۔ اور آیت 29 میں شیطان سے مراد وہی گمراہ کرنے والا دوست ہے۔

2370- یہاں قَوْمِي سے مراد کفار قوم ہی ہیں۔ کیونکہ اکثر حصہ قوم کا کفر پر تھا۔ پچھلی آیتوں میں انہی کا ذکر ہے اور آگے بھی مجرموں کا ذکر ہے جو نبی کے اعدا بن جاتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عملی طور پر مسلمانوں نے قرآن شریف کو یہاں تک چھوڑا ہے کہ وہ الفاظ جو کفار کے لیے تھے آج ان پر صادق آتے ہیں۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں اس پر قرآن (سارے کا) سارا ایک دفعہ ہی کیوں نہ اتارا گیا، اسی طرح (ضروری تھا) تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کرتے رہیں اور ہم نے اسے اچھی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ (2371)

وَ لَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾

اور وہ تیرے پاس کوئی اعتراض نہیں لاسکتے مگر ہم حق (جواب) اور عمدہ بیان تیرے پاس لاچکے ہیں۔ (2372)

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ ع

جو لوگ اپنے مونہوں کے بل دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، وہی بدتر حالت والے اور رستہ سے بہت دور پڑے ہوئے ہیں۔

2371- ﴿رَتَّلْنٰهُ﴾۔ رَتْل کسی چیز کی ترکیب کا حسن ہے اور [رَتَّلَ الكَلَامُ] کے معنی ہیں اس کی تالیف کو خوب کیا اور اسے واضح کیا اور اس میں آہستگی اختیار کی۔ اور [تَرْتِيْلُ فِي الْقِرَاءَةِ] اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور اس میں جلدی نہ کرنا ہے۔ (ل) ﴿وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ [المزمل: 4:73] ''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔''

قرآن کریم یا وحی الٰہی کا بتدریج نازل ہونا اس غرض کے لیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے جو وقتاً فوقتاً رسول پر طرح طرح کے مصائب اور مشکلات کے اندر نازل ہو رسول کو تسلی ملتی رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے بڑھ کر تسلی دینے والی کیا چیز ہوسکتی ہے۔ اور ترتیل سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کا بتدریج قرآن کریم کو نازل کرنا ہے اور یا اس سے اس کی ترتیب احسن مراد ہے۔ یعنی گو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل ہوا ہے مگر اس کو ترتیب ایسی دی گئی ہے جس نے اسے ایسا ہی منظم کلام بنا دیا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ نازل ہونے میں ہوتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی [بَيَّنَّاهُ بَيَانًا فِيْهِ تَرَسُّلٌ] (روح المعانی) مروی ہیں۔ سدی سے [فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيْلًا] مجاہد سے [جَعَلْنَا بَعْضُهُ فِي إِثْرِ بَعْضٍ]۔ (ر)

2372- مَثَلٍ ان کے اعتراض کو یہاں مَثَلٍ کہا ہے۔ گویا وہ بطلان میں مثال ہے۔ (ر)

تَفْسِيْر۔ فَسْر معنی معقول کا اظہار ہے اور تفسیر الفاظ مفرد اور غریب کی تشریح ہے اور تاویل بھی اس سے مراد ہے۔ (غ)

قرآن کریم نے یہاں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کوئی اعتراض جو اس پر کیا جائے اس کا جواب اس میں دے دیا گیا ہے اور نہ صرف **اعتراض کا جواب** ہے بلکہ نہایت عمدہ طور پر اسے واضح بھی کر دیا گیا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ﴿۳۵﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارونؑ کو مددگار بنایا۔

فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾

سو ہم نے کہا اس قوم کی طرف جاؤ جو ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ پس ہم نے انہیں جڑ سے اکھیڑ دیا۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ﴿۳۷﴾

اور نوحؑ کی قوم نے جب رسولوں کو جھٹلایا ہم نے انہیں غرق کر دیا اور ہم نے انہیں لوگوں کے لیے نشان بنایا اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾

اور عاد اور ثمود اور کنویں والوں کو اور اس کے درمیان بہت سی نسلوں کو (ہلاک کیا)۔[2373]

وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾

اور سبھی کے لیے ہم نے مثالیں بیان کیں اور سبھی کو ہم نے ہلاکت کو پہنچایا۔

وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾

اور وہ اس بستی پر گزرتے رہے ہیں جس پر برا مینہ برسایا گیا، تو کیا وہ اسے نہیں دیکھتے رہے۔ بلکہ وہ دوبارہ جی اٹھنے کی امید نہیں رکھتے۔[2374]

2373- ﴿اَصْحٰبَ الرَّسِّ﴾۔ رَسّ ایک وادی کا نام ہے اور رَسّ اصل میں تھوڑا اثر ہے جو کسی چیز میں موجود ہو۔ اور اس سے [رَسَّ الْمَيِّتُ] کے معنی ہیں میت کو دفن کیا گیا۔ (غ) تفاسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں ثمود میں سے تھے، بعض اسے یمامہ کی ایک بستی بتاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں انہوں نے اپنے نبی کو ایک کنویں میں گرا دیا تھا جس کا نام رَسّ تھا۔ (ج) ابن جریر آخری قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ رَسّ کلام عرب میں ہر ایک کھودی ہوئی جگہ یا کنویں کو کہا جاتا ہے۔

2374- یہ بستی سدوم ہے اور جو مینہ ان پر برسایا گیا وہ پتھروں کی بارش تھی جو آتش فشاں پہاڑ سے ہوئی۔ [دیکھو نمبر: 1491]

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

اور جب تجھے دیکھتے ہیں تو صرف ہنسی بناتے ہیں۔ کیا یہ وہ ہے جسے اللہ نے رسول بنایا؟

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

قریب تھا کہ وہ ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا اگر ہم ان پر ثابت نہ رہتے اور وہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں گے کہ کون رستہ سے دور جا پڑا ہے۔ (2375)

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾

کیا تو نے اسے دیکھا جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے، تو کیا تو اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ (2376)

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾ ع 4 10 2

یا کیا تو خیال کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ صرف چارپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ رستہ سے اور بھی دور بہکے ہوئے ہیں۔ (2377)

2375- اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے وعظ کا اثر کیسا تھا۔ اس قدر خطرناک بت پرستوں کو بھی متزلزل تو کر دیا، مگر ڈھٹائی سے انہوں نے اپنے بتوں کو نہ چھوڑا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کس قسم کا خطرناک عقیدہ بت پرستی کا ان میں مروج تھا۔

2376- بیان تو کفار کا ہے کہ اصل میں انہوں نے اپنی خواہش کو معبود بنایا ہوا ہے، ورنہ بتوں کی خدائی تو ٹوٹ چکی ہے۔ لیکن توحید کی تعلیم میں ایک نہایت ہی لطیف اصول بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ شرک یا بت پرستی صرف یہی نہیں کہ پتھروں یا ہواؤں کو یا اور چیزوں کو یا بعض انسانوں کو خدا مانا جائے، بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ انسان اپنی **حرص و ہوا کے اتباع** میں کسی حق بات کی پرواہ نہ کرے، کامل موحد نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اس کی حرص و ہوا اس کے تابع نہ ہو۔ جو شخص خواہشات کا غلام ہے وہ موحد نہیں۔

2377- چارپایوں کی طرح تو اس لیے کہ جو انسان کو اللہ تعالیٰ نے سمع اور عقل دی تھی ان سے فائدہ نہ اٹھایا اور حیوانوں کی طرح ہو گئے۔ اور اَضَلُّ یعنی زیادہ گمراہ اس لیے کہا کہ حیوان کو تو عقل ملی نہیں، انہوں نے باوجود عقل کے غلط راہ پر قدم مارا۔ مگر اصل میں عرب کی اس حالت پر توجہ دلائی ہے جو اسلام سے پیشتر تھی کہ وہ لوگ حیوانی زندگی پر گرتے گرتے آخر کار بالکل حیوانوں کی طرح ہی ہو گئے۔ سمع اور عقل سے کام نہ لیتے تھے اور نہ کسی مصلح کی بات کو سنتے یا اس کی کچھ پروا کرتے تھے۔ نہ ان کے اندر انسانی سوسائٹی کو حیوانات سے ممیز کرنے والی صفات رہی تھیں۔ چارپائے کو تو پکڑ کر بھی رستہ پر لایا جا سکتا ہے مگر وہ

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝۴۵

کیا تو نے اپنے رب (کے کام) پر غور نہیں کیا کہ کس طرح سایہ کو لمبا کرتا ہے اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل ٹھہرایا ہے۔ (2378)

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝۴۶

پھر ہم اسے آہستہ آہستہ سمیٹتے ہوئے اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ (2379)

اس قابل بھی نہ تھے۔ اس ایک فقرہ كَالْاَنْعَامِ میں بتا دیا کہ عرب کے لوگوں میں نہ اخلاق و روحانیت رہ گئی تھی، نہ سیاست، نہ تمدن، نہ معاشرت کے صحیح اصول باقی رہے تھے اور واقعی ان کی حالت پر غور کیا جاتا ہے تو عامہ حالت ان کی ایسی ہی تھی کہ انسان کا نام بھی ان پر نہ آ سکتا تھا۔ دن رات باہم جنگ و جدل، عقائد نہایت ذلیل، پرلے درجہ کی توہم پرستی، حیوانیت کا جوش، شراب خوری اور زنا کاری اور قمار بازی کی کثرت، علم سے بالکل بے بہرہ۔ یہ وہ چار پایوں سے بدتر قوم تھی جس کی اصلاح کے لیے رسول اللہ ﷺ کو کھڑا کیا گیا۔ ان میں ہر قسم کی خوبیاں پیدا کر دینا یہ وہ فرقان تھا جو آپ ﷺ کے وجود سے ظہور میں آیا۔

2378- ﴿دَلِيْلًا﴾۔ دَلَالَةٌ وہ ہے جس سے کسی چیز کی معرفت حاصل کی جائے۔ جیسے لفظوں کی دلالت معنی پر ﴿مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ﴾ [السبأ: 14:34] ''تو انہیں اس کی موت کا پتہ کسی چیز نے نہ دیا'' اور دلیل اس سے مبالغہ ہے۔ (غ)

ظِلَّ کے لیے [دیکھو نمبر: 676] رات کی تاریکی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور ابن جریر میں جس قدر اقوال ہیں سب میں یہاں ﴿ظِلَّ﴾ سے مراد طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک کی حالت لی گئی ہے۔ تو یہاں سایہ کے لمبا کرنے سے مراد رات کا طول ہے اور اسے ساکن کرنے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہوتی تو رات کی تاریکی ہی ٹھہری رہتی۔ مگر پھر سورج نکلتا ہے اور سایہ آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور سورج کو اس پر دلیل ٹھہرانے کے یہ معنی ہیں کہ سورج سے وہ زائل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یا یہ کہ چونکہ ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اس لیے اگر سورج نہ نکلتا تو سایہ یا تاریکی کا بھی علم نہ ہوتا کہ وہ کیا چیز ہے۔ (ج) اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ عَلٰی بمعنی مَعَ ہے اور مراد یہ ہے کہ ظل اور سورج کو اپنی وحدانیت پر ہم نے دلیل ٹھہرایا ہے۔ (ر) اوپر کی آیت میں چونکہ عرب کی حالت کا ذکر کیا تھا کہ وہ تمام خوبیوں سے محروم ہو گئے ہیں اور چار پایوں کی طرح ہیں، تو اب طلوع آفتاب میں یہ اشارہ کیا ہے کہ **آفتابِ نبوت کے طلوع** سے ان کی حالت کس طرح تبدیل ہو کر ظلمت دور ہو جائے گی۔

2379- ﴿قَبَضْنٰهُ﴾۔ قَبْض کے لیے [دیکھو نمبر: 314] یہاں اشارہ اس طرف ہے کہ سورج سے سایہ (یعنی تاریکی) جاتی رہے گی۔ (غ)

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو (موجب) آرام بنایا اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت بنایا۔ (2380)

وَ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری کے طور پر بھیجتا ہے اور ہم اوپر سے پاک کرنے والا پانی اتارتے ہیں۔ (2381)

﴿یَّسِیْرًا﴾ ا۔ یَسِیْر قلیل شے کو کہا جاتا ہے۔ (غ) اور بعض نے اس کے معنی سَرِیْعٌ کیے ہیں۔ (ج) اور بعض نے [قَلِیْلًا قَلِیْلًا] یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے۔ (ر) اور مراد یہ ہے کہ ظلمت کفر تدریجاً کم ہوتی جائے گی۔

2380- ﴿سُبَاتًا﴾۔ سَبْت کے اصل معنی کاٹنا ہیں۔ [نمبر: 94] اور سُبَات سے مراد ہے قطع عمل۔ (غ)

﴿نُشُوْرًا﴾۔ نَشْر کے اصل معنی پھیلانا ہیں۔ ﴿وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ [التکویر: 10:81] ''اور جب صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے۔'' ﴿وَّ النّٰشِرٰتِ نَشْرًا﴾ [المرسلٰت: 3:77] ''اور دور دور پھیلا دینے والی۔'' اور نَشْر مُردہ کے جی اٹھنے کے معنی ہیں۔ [نَشْرَ الثَّوْبِ] (یعنی کپڑے کے پھیلا دینے) سے ماخوذ ہے۔ اور دن کے نُشُور بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس میں انسانوں کا انتشار اور رزق کی تلاش میں نکلنا مقرر کیا، اور لوگوں کا انتشار اپنی حاجات میں لگ جانا ہے۔ ﴿ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝﴾ [الروم: 20:30] ''پھر دیکھو تم انسان بن کر پھیل جاتے ہو۔'' ﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ [الجمعة: 10:62] ''پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ۔'' (غ) اور تفاسیر میں دونوں طرح معنی کیے گئے ہیں، یعنی اُٹھنا۔ کیونکہ نُشُور نیند اور موت دونوں سے اٹھنے پر بولا جاتا ہے اور معاش کے لیے انتشار یعنی پھیل جانا۔ اور ابن جریر نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس میں روحانی بیداری کی طرف اشارہ ہو جو اصل مضمون ہے۔

2381- ﴿طَهُوْرًا﴾۔ طَهَارَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 39] وغیرہ۔ طَهُور مصدر بھی ہوسکتا ہے، اور اس چیز کا نام بھی ہوسکتا ہے جس کے ساتھ دوسری چیز کو پاک کیا جائے اور صفت بھی۔ اور بعض کے نزدیک طَهُور بمعنی مُطَهِّر ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے درست ہے کہ طاہر دو طرح پر ہے۔ ایک جس کی طہارت دوسرے کو نہ پہنچے، جیسے کپڑا۔ دوسرا وہ جس کی طہارت دوسرے کو پہنچ سکے۔ یہاں طَهُور اسی معنی میں ہے۔ (غ) ﴿وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ [الدھر: 21:76] ''اور انہیں پاک کرنے والی چیز پلائے گا۔''

ہواؤں کے بھیجنے میں یہ اشارہ ہے کہ پہلے اس کا اثر تھوڑا تھوڑا معلوم ہوتا ہے اور پھر زور کی بارش ہوتی ہے تو مردہ شہر جی اٹھتا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔ اور یہاں عرب کے روحانی مردوں کے اٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی لیے یہاں ﴿مَآءً طَهُوْرًا﴾ فرمایا کہ آسمانی وحی کی بارش سے ہر قسم کی پلیدیاں دور ہو جاتی ہیں۔ جس طرح پانی ہر قسم کی غلاظتوں کو دور کر دیتا ہے۔

لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّ نُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾

تا کہ ہم اس کے ساتھ مردہ شہر کو زندہ کریں اور ان میں سے جو ہم نے پیدا کیے ہیں بہت سے چارپایوں اور لوگوں کو اسے پلائیں۔ (2382)

وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

اور ہم نے اسے ان کے درمیان طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ مگر بہت سے لوگوں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں۔ (2383)

وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ (2384)

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

سو کافروں کی بات نہ مان اور اس (قرآن) کے ساتھ ان سے (وہ) جہاد کر (جو) بڑا جہاد (ہے)۔ (2385)

2382- ﴿اَنَاسِيَّ﴾۔ انسان یا اِنْسِیّ کی جمع ہے۔ اور عرب کے مردہ ملک کے زندہ کرنے کے بعد پھر چارپایوں اور انسانوں کے اسے پلانے میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کو بھی یہ پہنچے گا۔ اس کی وضاحت [آیت:51] میں کی ہے۔

2383- صَرَّفْنٰهُ میں ضمیر بارش کی طرف نہیں جیسا کہ خیال کیا گیا ہے۔ بلکہ قرآن کی طرف ہے یا اس مضمون کی طرف جو بیان ہو رہا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کے ذریعہ سے جو انقلاب عظیم آنے والا ہے اسے طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ یہاں بھی دو مختلف پیرائے اختیار کیے ہیں۔ پہلے طلوع آفتاب کے رنگ میں پھر بارش کے نزول کے رنگ میں۔

2384- شروع سورت میں فرمایا تھا کہ فرقان اس لیے اتارا ہے کہ سب قوموں کے لیے آنحضرت ﷺ نذیر ہوں اور یہاں فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں الگ الگ نذیر اٹھا کھڑا کرتے۔ تو مطلب یہ ہے کہ ہماری مشیت نہ تھی بلکہ ارادہ الٰہی یہی تھا کہ بالآخر تمام قوموں کے لیے ایک ہی نذیر ہو اور اس کی وجہ ظاہر ہے، تا کہ نسل انسانی میں وحدت پھیلے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تسلسل مضمون قرآن شریف میں کس طرح چلتا ہے۔

2385- یہاں بِهٖ میں ضمیر قرآن کی طرف ہونا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور اسلام کی طرف ہونا ابن زید سے مروی ہے۔ (ج) اور اول صحیح ہے۔ کیونکہ قرآن شریف کا ہی ذکر اوپر بھی ہے اور قرآن شریف کی طرف ضمیر بغیر اس کا پہلے ذکر ہونے کے بھی بوجہ اس کی عظمت اور شہرت کے آئی ہے۔ جیسے ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ﴾ [القدر: 1:97] ''ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا'' یا

وَ هُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

اور وہی ہے جس نے دو دریا ملا رکھے ہیں۔ یہ میٹھا مزیدار ہے اور وہ کھاری کڑوا، اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ اور ایک حائل ہوئی ہوئی روک بنا دی ہے۔ (2386)

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴿۵۴﴾

اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا۔ پھر اسے نسب اور سسرال (والا) بنایا اور تیرا رب قدرت والا ہے۔ (2387)

﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۚ﴾[القیامة: 17:75] ''ہمارے ذمے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہے۔'' اور یہاں قرآن کریم کے ذریعہ سے حق پھیلانے کو جہادِ کبیر کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کیونکہ یہی اصل اور بڑا جہاد ہے اور ہر وقت قائم رہتا ہے۔ اور جہاد سیف کی ضرورت کبھی کبھی پیش آتی ہے۔

2386- مَرَجَ کی اصل خلط ہے یعنی ملا دینا، اور اسی سے ہے ﴿فِیْۤ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ﴾[قٓ: 5:50] ''الجھن کی حالت میں ہیں۔'' (یعنی جس میں التباس اور اختلاط واقع ہو گیا ہے) اور مَرْجَان چھوٹا موتی ہے ﴿كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ۚ﴾[الرحمٰن: 58:55] ''گویا کہ وہ یاقوت اور مونگا ہیں۔'' اور ﴿مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾[الرحمٰن: 15:55] ''آگ کے شعلے سے۔'' میں مَارِج سے مراد مختلط شعلہ ہے۔ (غ) اور [مَرَجَ الدَّابَّة] کے معنی ہیں جانور کو چراگاہ میں چھوڑ دیا تاکہ وہ چرے۔ اور مَرْج کے معنی اجراء بھی ہیں یعنی جاری کر دینا۔ اور یہاں دونوں معنی کیے گئے ہیں۔ یعنی ملا دیا اور جاری کیا یا چلایا۔ (ل)

فُرَاتٌ بہت میٹھے پانی کو کہتے ہیں، جس طرح اُجَاجٌ سخت کھاری کو۔

دریاؤں کا **پانی میٹھا** ہوتا ہے اور **سمندر کا کھاری**، پس دو دریا ایک میٹھا اور ایک کھاری جو باہم ملتے بھی ہیں اور ان کے درمیان روک بھی ہے۔ اسی طرح پر ہیں کہ دریاؤں کا پانی سمندر میں جا ملتا ہے بایں وہ کھاری ہے اور یہ شیریں۔ پھر اسی سمندر سے پانی اڑ کر خشکی پر برستا ہے اور اس سے دریا بنتے ہیں۔ مگر سمندر کا کھاری پن ان میں نہیں آتا۔ یہ ان کے درمیان برزخ اور حجر ہے۔ اور اشارہ یہاں جسمانی و روحانی زندگی کے سرچشموں کی طرف ہے جو دنیا پر گرجاتا ہے۔ اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسی کھاری پانی پینے والوں کی کہ وہ پیاس کو اور بڑھاتا جاتا ہے اور جو روحانیت کے چشمہ سے اپنے آپ کو سیراب کرتا ہے تو اس کی شیرینی تسکین پیدا کرتی ہے اور اس کو اطمینان قلب میسر آجاتا ہے۔ مگر طالب دنیا کو اطمینان قلب نہیں ملتا۔

2387- ﴿نَسَبًا وَّ صِهْرًا﴾۔ نَسَب بھی قرابت ہے اور صِهْر بھی۔ مگر نَسَب آباء یعنی مرد کی طرف سے ہے اور صِهْر عورت کی طرف سے۔ اور یہاں مراد ذُوْ نَسَبٍ اور ذُوْ صِهْرٍ ہے، یعنی مرد اور عورت۔ اور بجائے ذَكَرٌ اور اُنْثٰی کے یہ الفاظ اس لیے استعمال

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾

اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نفع نہیں دیتا اور نہ انہیں نقصان پہنچاتا ہے۔ اور کافر اپنے رب کے خلاف (دوسروں کا) مددگار بنتا ہے۔(2388)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۵۶﴾

اور ہم نے تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا (بنا کر) بھیجا ہے۔

قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

کہہ، میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ جو چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۚۛ ﴿۵۸﴾ مع

اور زندہ (خدا) پر بھروسہ کر جو مرتا نہیں اور اس کی حمد کرتا ہوا تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کے قصوروں سے باخبر رہنے کو کافی ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۛۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾

وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر غالب ہے بے انتہا رحم والا۔ سو اس سے سوال کر جو اس سے خبردار ہے۔(2389)

فرمائے کہ ان کے پھیلنے کی طرف بھی اشارہ ہو۔ (ر)

2388- ظَهِيْر۔ ظَاهَرْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کی مدد کی۔ اور ظَهِيْر کے معنی مددگار ہیں۔ ﴿وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ﴾ [الممتحنة: 9:60] ''اور تمہارے نکالنے میں (دوسروں کی) مدد کی۔'' ﴿وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ﴾ [التحريم: 4:66] ''اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو۔'' ﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ [القصص: 86:28] ''سو تو کافروں کا مددگار نہ ہو۔'' ﴿بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾ [التحريم: 4:66] ''اس کے بعد مددگار ہیں۔'' اور یہاں ظَهِيْر کے معنی [مَظْهُوْرٌ بِهٖ] کیے ہیں۔ یعنی اپنے رب کے سامنے ذلیل ہے۔ گویا پیٹھ کے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ (غ)

2389- ﴿فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا﴾ کے معنی کیے ہیں [فَسْئَلْ بِالرَّحْمٰنِ خَبِيْرًا بِخَلْقِهٖ] (ج) یعنی رحمٰن سے سوال کر جو اپنی خلق سے

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو، کہتے ہیں اور رحمٰن کیا ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے لیے تو حکم دیتا ہے، اور اس نے انہیں نفرت میں بڑھایا۔ (2390)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾

وہ (ذات) بابرکت ہے جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں سورج اور روشنی دینے والا چاند بنایا۔ (2391)

خبردار ہے۔ بِہٖ کی ضمیر خلق کی طرف جاتی ہے۔ اور یا سوال کرنے سے مراد حاجات کا مانگنا ہے۔ اوپر بھی کفار کی ایذا رسانی کا ذکر تھا جس کے جواب میں فرمایا ﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾۔ اور یہاں بھی یہی بتایا ہے کہ مخلوق کا خیال مت کرو جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو۔

2390- ان کا ﴿مَا الرَّحْمٰنُ﴾ کہنا تجاہل سے ہے۔ جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا ﴿وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الشعرآء: 23:26] ''اور جہانوں کا رب کون ہے؟'' اور یہ جو بعض مفسرین نے لکھ دیا ہے کہ انہوں نے مسیلمہ کذاب کو مراد لیا ہے جو رحمٰن یمامہ کہلاتا تھا تو یہ صحیح نہیں۔ اس لیے یہ سورت مکی ہے اور مسیلمہ کا واقعہ بہت بعد کا ہے۔

2391- ﴿سِرٰجًا﴾۔ سِرَاج چراغ کو کہتے ہیں۔ اور پھر ہر روشنی دینے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ ﴿وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ [نوح: 16:71] ''اور سورج کو چراغ بنایا۔'' (غ) اور سورج دن کا سراج ہے۔ اور حدیث میں ہے [عُمَرُ سِرَاجُ أَهْلِ الْجَنَّةِ] یعنی عمر اہل جنت کے سورج ہیں، کیونکہ ان کے اسلام میں داخل ہونے سے اخفا اور خوف جاتا رہا اور لوگوں نے اسلام کو ظاہر کیا۔ گویا آپ نے سورج کا کام دیا۔ اور سِرَاج کے معنی سورج بھی ہیں۔ ﴿وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا﴾ [النبأ: 13:78] ''اور ہم نے سورج کو روشنی اور گرمی دینے والا بنایا۔'' ﴿وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝﴾ [الأحزاب: 46:33] ''اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا سورج۔'' (ل)

قَمَر چاند کو کہا جاتا ہے جب وہ حالت امتلا میں ہو اور یہ تیسری رات کے بعد ہوتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے۔ [قَمَرْتُ فُلَانًا] کے معنی ہیں خَدَعْتُهٗ۔ (غ) اور حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا [هِجَانَ أَقْمَرُ] جہاں اَقْمَرُ کے معنی ہیں نہایت سفید رنگ (هِجَان = فرد مایہ) اور چاند کو پہلی دو راتوں میں اور آخری دو راتوں میں ھلال کہا جاتا ہے اور اس کے سوائے باقی میں قمر۔ (ل)

جس خدا نے روشنی دینے والے اجرام اس عالم ظاہری میں بنائے ہیں اسی نے عالم روحانی میں بھی روشنی دینے والے بنائے ہیں اور انہی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ کیونکہ آگے ذکر ﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ﴾ کا آتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا نام سراج قرآن کریم

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا اس کے لیے جو چاہتا ہے کہ نصیحت حاصل کرے یا شکر گزاری کا ارادہ کرتا ہے۔ (2392)

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں سلام۔ (2393)

میں آیا ہے اور اصحاب رسول کو نجوم حدیث میں کہا ہے [أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ] یعنی **ستارے اور قمر بھی رسول اللہ ﷺ ہی ہیں**۔ جیسے کہ اس آیت میں اشارہ ہے ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝﴾ [الشمس: 91:1, 2] ''سورج اور اس کی روشنی گواہ ہیں۔ اور چاند جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔'' اور قمر آپ کو اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ آپ کا نور نورِ خدا سے ہے نہ ذاتی۔ اور شمس اس لحاظ سے کہ آپ کی روشنی دیگر انبیاء سے ممتاز ہو کر کل عالم پر محیط ہوگئی۔ اور یہ آیت اس انقلاب کے لیے بطور تمہید ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

2392- ﴿خِلْفَةً﴾ اس حالت کو کہا جاتا ہے جب ہر ایک دوسرے کے پیچھے آئے۔ (غ) مراد یہ ہے کہ جو نفل نماز رات کو رہ جائے اسے دن پورا کر لے یا یہ کہ دن اللہ تعالیٰ کے صنائع و بدائع میں فکر کے لیے ہے اور رات شکر یعنی عبادت کے لیے۔ بیشتر حصہ عبادت کا رات میں ہی آتا ہے۔

2393- ﴿سَلٰمًا﴾۔ سَلَامٌ بمعنی سلامتی ہے اور فعل محذوف ہے یعنی ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں اور یا سلام صفت ہے اور مطلب ہے کہ سلامتی کا قول یعنی اصلاح کی بات یا اچھی بات۔

اس آیت سے لے کر آخر تک صحابہ رضی اللہ عنہم کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ مکہ کا آخری زمانہ ہے اور مدینہ کی تیاریاں ہیں۔ اور ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ ان چند سال کے اندر اس ملک کے اندر جس کے انسانوں کی حالت چارپایوں کی سی تھی نبی کریم ﷺ کی قوت قدسی نے اور قرآن کریم کی آیات پاک نے **کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا**۔ ہر ایک نیکی جو یہاں گنی ہے وہ کسی پہلی بدی کے مقابل پر ہے جو عرب میں مروج تھی اور جس پر فخر کیا جاتا تھا۔ اول ان کا انکساری سے چلنا اور یہ ان کی **پہلی متکبرانہ روش** کے مقابل پر ہے۔ جب ہر ایک کے حقوق کو پامال کرنا ان کا فخر تھا۔ پھر فرمایا کہ جاہل انہیں کچھ بری بات کہیں تو وہ اس کا جواب برائی سے نہیں دیتے، بلکہ جہالت کے مقابل میں سلامت روی اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے ان کا یہ فخر تھا کہ جہالت کے مقابل پر اور زیادہ جہالت دکھاتے تھے۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے [أَلَا لَا يَجْهَلَنْ أَحَدٌ عَلَيْنَا ... فَنَجْهَلَ فَوْقَ

وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿۶۴﴾

اور وہ جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ کرتے اور کھڑے ہو کر۔ (2394)

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾

اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم سے دوزخ کا عذاب ہٹا دے کیونکہ اس کا عذاب بھاری مصیبت ہے۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾

وہ (تھوڑا) ٹھہرنے کے لیے اور (ہمیشہ) رہنے کے لیے بری جگہ ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں نہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ (موقع پر تنگی) کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) ان (دو حالتوں) کے درمیان اعتدال پر ہے۔ (2395)

جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا] اور ﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ﴾ کا لفظ یہاں اس اشارہ کے لیے استعمال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت سے ایک نبی کو ان کے اندر مبعوث کر کے اور اپنا کلام نازل کر کے انہیں اس مقام پر پہنچایا، ورنہ اپنی سعی سے وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔

2394- اہل عرب راتوں کو شراب خوری، ناچ، گانے بجانے میں صرف کرتے تھے جس طرح اہل یورپ آج کرتے ہیں۔ یہ قرآن کی تعلیم کا اثر تھا کہ نہ صرف راتوں کی عیاشی کو چھوڑا بلکہ وہی راتیں اب عبادت الٰہی میں صرف ہونے لگیں، کتنا بڑا انقلاب ہے۔ کیا آج یورپ میں بال اور سینما اور تھیٹر کو دور کر کے کوئی انہیں تہجد خواں بنانے کا خیال دل میں لا سکتا ہے۔ یہی وہ معجزہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے عرب میں کر کے دکھایا۔ اس سے بڑھ کر کسی شخص کے منجانب اللہ ہونے کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ وہ شراب پی کر عیاشی کرتے تھے اور **شراب اور عیاشی چھڑا کر محبت الٰہی** کی ایسی شراب پلائی ﴿وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ کہ ساری ساری رات عبادت الٰہی میں صرف کرتے تھے، کہاں سے کہاں پہنچایا۔

2395- اَسْرَافٌ **معاصی میں خرچ کرنا۔** قَتْرٌ طاعت میں خرچ کرنا سے رکنا قوام وسط و عدل ہے۔ (ر) اسی لیے قوام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کریں اور اس کے محارم میں خرچ کرنے سے رک جائیں۔ پہلی حالت یہ تھی کہ بے جا رسوم و رواج میں، نمود کے لیے، عیاشی میں سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ بیکسوں، غریبوں پر، نیک کاموں میں جہاں نام نہ ہو بخل کرتے تھے۔ آج بھی مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ غریب سے غریب آدمی جو رسم و رواج کے ماتحت اور نمود کے لیے خرچ کرنے لگتا ہے

وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾

اور وہ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے قتل نہیں کرتے سوائے اس کے کہ انصاف چاہے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے وہ (اپنے) گناہ کی سزا پائے گا۔ (2396)

تو مکان اور جائیداد بیچ کر سود پر روپیہ لے کر بھی امراء کی طرح خرچ کرتا ہے۔ امیر سے امیر آدمی سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے لیے کہو، جہاں نمود نہ ہو تو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی غریب آدمی نہیں۔ مال تو خرچ ہوتا ہی ہے، اس خرچ کو حالت اعتدال میں لانا ہی سب سے مشکل کام ہے۔ آنحضرت ﷺ کی قوت قدسی نے اس خوبی کو پیدا کر کے قوم کی طاقت کو برمحل لگا دیا۔

2396- اَثَام اور اثم کے ایک ہی معنی ہیں۔ [دیکھو نمبر: 108] اور یہاں عذاب کو اَثَام کہا ہے اس لیے کہ اس کی وجہ سے عذاب آتا ہے۔ اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان باتوں کا ارتکاب دوسرے گناہوں کے ارتکاب میں مبتلا کر دے گا۔ (غ) اور اَثَام بمعنی عقوبت یا جزائے اثم بھی آتا ہے۔ (ل)

یہاں ان تین باتوں کا ذکر کیا ہے جن میں عرب سب سے بڑھ کر مبتلا تھے اور جن کی وجہ سے وہ نہایت ذلت کی حالت میں گرے ہوئے تھے۔ یعنی **شرک، قتل، زنا**۔ شرک کی حالت تو یہ تھی کہ بن تراشے پتھروں، درختوں، جانوروں تک کی پرستش کرتے تھے اور بت پرستی کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنا علیحدہ بت رکھتا تھا۔ تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ کوئی کام نہ کرتے تھے جب تک فال نہ لیتے تھے۔ اس کی بجائے کیسی توحید پھیلائی کہ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ چھوڑا بلکہ آخری مرتبہ **کمال توحید** کا (کہ حرص و ہوا کے اتباع سے انسان بچے) بھی طے کرا دیا اور توحید کی آگ ان کے سینوں میں ایسی مشتعل ہوئی کہ اس کے پھیلانے کے لیے دنیا کے کناروں تک چلے گئے اور کوئی تکلیف خدا کی راہ میں انہیں تکلیف معلوم نہ ہوئی۔ قتل کی یہ حالت تھی کہ انسان کی زندگی کی قدر چڑیا کے برابر بھی نہ تھی۔ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر ایک دوسرے کو قتل کر دینا معمولی کام تھا۔ ذرا ذرا بات پر قوموں میں باہم جنگ چھڑتی تو سالہا سال تک ختم نہ ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کے انفاس قدسی نے اس بلا سے نجات دی۔ زنا کی کثرت کی یہ حالت تھی کہ علانیہ شعروں میں زنا کرنے پر فخر کرتے اور زن و مرد کے ننگے تعلقات کو شعروں میں فخریہ بیان کرتے۔ جس طرح آج کل اہل یورپ بجائے شعروں کے تصویروں میں انہیں ظاہر کرتے ہیں اور فخر سے ایسی تصویروں سے اپنے کمرے سجاتے ہیں۔ اسی طرح اہل عرب فحش شعروں سے اپنی مجلسوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ اس قوم کو درست کرنا ایسا ہی تھا جیسا آج ایک شخص اہل یورپ سے زنا کاری چھڑا کر ان میں وہ قوت پیدا کر دے کہ دوسرے کی بی بی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہ وہ کام تھا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی قوت قدسی نے کیا۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

اس کے لیے قیامت کے دن دو چند عذاب ہوگا اور اس میں ذلیل ہو کر رہے گا۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کرتا رہا، تو ایسے لوگوں کی بری زندگی کو اللہ نیک زندگی سے بدل دیتا ہے۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2397)

وَ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے، تو وہ اللہ کی طرف اچھا رجوع کرآتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب لغو پر گزرتے ہیں بزرگانہ طور پر گزرتے ہیں۔ (2398)

2397- **برائیوں کو نیکیوں میں بدل دینے سے کیا مراد ہے:** یہ نہیں کہ اگر ایک شخص پہلے زنا کرتا رہا تو توبہ سے زنا کی جگہ عبادت لکھ لی جاتی ہے۔ گو بعض لوگوں نے یہ معنی بھی کر لیے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ کسی صورت میں درست نہیں۔ سَيِّاٰتٍ سے مراد یہاں بدی کی قوتیں یا ملکہ ہے اور حَسَنٰتٍ سے مراد نیکی کی قوتیں یا ملکہ ہے (ر) اور مطلب یہ ہے کہ توبہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدی کی جگہ نیکی کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ جس طرح وہ اپنے آپ کو لگائے وہی خیالات اس پر غالب آنے شروع ہو جاتے ہیں۔

2398- ﴿مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ کے معنی یوں بھی کیے ہیں کہ قبیح بات کو کنایۃً بیان کرتے ہیں صراحت سے نہیں۔ اور یا یہ کہ جب لوگوں کو لغو میں مشغول پاتے ہیں تو ان کے ساتھ شامل نہیں ہوتے۔ (غ) خاص خاص آدمیوں کو چھوڑ کر عام حالت اہل عرب کی یہی تھی کہ انہیں جھوٹ کی کچھ پروا نہ تھی۔ وقتِ ضرورت جھوٹے معاہدے بھی کر لیتے تھے۔ منافقوں کا کتنا بڑا گروہ تھا جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلاتے تھے۔ ان کی جگہ ایسی **صداقت کی محبت** پیدا کی کہ جو روایت صحیح طور پر صحابی تک پہنچ جائے وہ جھوٹی نہیں۔ اور لغو کہانیوں اور لغو مشغلوں میں مبتلا قوم کو ایسے **مفید کاموں میں** لگایا کہ نہ صرف نیکی میں ہی دنیا کے رہبر ہوئے بلکہ ہر قسم کے علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔ اور فتح کے ساتھ نظم و نسق ملکی کو کمال تک پہنچایا۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ﴿۷۳﴾

اور وہ کہ جب انہیں ان کے رب کے حکموں سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ (2399)

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۵﴾

انہیں بلند مقام بدلہ میں دیا جائے گا، اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور اس میں انہیں دعا اور سلامتی ملے گی۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾

اسی میں رہیں گے، اچھی قرارگاہ اور ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع 6 17 4

کہہ، میرا رب تمہاری کچھ پروا نہیں کرتا اگر تمہاری دعا نہ ہو۔ سو تم نے جھٹلایا پس (اس کی سزا) تمہارے لازم حال ہوگی۔ (2400)

2399- یہ ان کی خواہش کہ ہمیں متقیوں کے امام بنا، ان کے **کمال روحانی کے معراج** کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی تڑپ نہیں کہ ہم متقی بنیں بلکہ یہ ہے کہ ہم متقیوں کے امام بنیں۔ یعنی جو لوگ ہم سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی ہمارے نمونہ کو دیکھ کر متقی بنیں۔

2400- يَعْبَؤُا۔ [مَا عَبَاْتُ بِهٖ] کے معنی ہیں میں نے اس کی پروا نہ کی۔ اور اس کی اصل عَبْءٌ ہے جس کے معنی ثقل ہیں۔ (غ)

یہاں بتایا ہے کہ انسان جس قدر اپنا تعلق خدا سے پیدا کرتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عزت ہوتی ہے۔ ورنہ مخلوق تو بہائم بھی ہیں۔ اسی تعلق باللہ کی طرف انہیں بلایا گیا، تو انہوں نے تکذیب کی۔ پس جب وہ عزت کے مقام کی طرف نہیں آتے تو فرقان کا دوسرا پہلو عذاب کا آنا ہے، وہ آ کر رہے گا۔ اس لیے کہ **فرقان** یہی ہے کہ نیکوں کو بلند مقام پر پہنچایا جائے اور بدوں کو بدی کی سزا دی جائے تا کہ دونوں میں کھلا کھلا فرق نظر آ جائے۔ اس لیے ماننے والوں کی حالت کا ذکر کر کے اور یہ بتا کر کہ وہ کس ذلیل حالت سے نکل کر کس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں، اب مکذبین کا ذکر کیا کہ ان پر سزا آئے گی۔

سورۃ الشعراء

نام:

اس سورت کا نام اَلشُّعَرَآءُ ہے اور اس میں 11 رکوع اور 227 آیتیں ہیں اور اس کا یہ نام اس کے آخری رکوع سے لیا گیا ہے، جہاں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے جس طرح پہلے انبیاء کو وحی ہوئی۔ اس بات کی تردید کی ہے کہ یہ کہانت ہے یا شاعری ہے۔ اور بتایا ہے کہ شعراء کی عامہ حالت کیسی ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام اَلشُّعَرَآءُ ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں اس بات کا ذکر کر کے کہ آنحضرت ﷺ کو کس قدر غم اس وجہ سے تھا کہ لوگ ایمان نہیں لاتے، بتایا ہے کہ اسلام آخر کار کامیاب ہوگا اور لوگ اسلام لے آئیں گے۔ اور چونکہ شروع سورت میں مقطعات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس لیے اسلام کی کامیابی کے متعلق آنحضرت ﷺ کو تسلی دے کر پھر انبیاء علیہم السلام کا ذکر بطور مثال کیا ہے۔

④، ③، ② ان میں مقدم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کو کیا ہے اور یہ ذکر دوسرے، تیسرے اور چوتھے رکوع میں چلتا ہے۔

⑤ پانچویں رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے جدامجد ہیں اور ہر دو سلسلے یعنی موسوی اور سلسلہ محمدی انہی سے چلتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخی ترتیب سے

⑥ چھٹے رکوع میں حضرت نوح علیہ السلام کا

⑦ ساتویں میں حضرت ہود علیہ السلام کا،

⑧ آٹھویں میں حضرت صالح علیہ السلام کا،

⑨ نویں میں حضرت لوط علیہ السلام کا،

⑩ دسویں میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اور

⑪ گیارھویں رکوع میں بتایا ہے کہ قرآن منجانب اللہ وحی ہے اور یہ کاہن یا شاعر کا کلام نہیں ہوسکتا۔

تعلق:

اس سورت اور اس کے بعد کی دو سورتوں کا مضمون قریباً ملتا جلتا ہے۔ تینوں میں زیادہ تر توجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات کی

اٰیَاتُهَا 227 (26) سُوۡرَةُ الشُّعَرَآءِ مَکِّیَّةٌ (47) رُکُوۡعَاتُهَا 11

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

منزل 5 طٰسٓمّٓ ① طور سینا پر موسیٰ (کی وحی پر غور کرو)۔(2401)

طرف یا سلسلہ موسوی کی طرف دلائی ہے۔اور گو یہ ذکر تینوں سورتوں میں یکساں نہیں۔مگر تینوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کا خاتمہ فرعون کے غرق ہونے پر کیا ہے اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرقان تھا۔یوں سورۂ فرقان کے بعد فرقانِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔اور اس میں بھی اصل مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا ذکر ہی ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاص مشابہت تھی جس کا ذکر توریت اور قرآن کریم دونوں میں صاف الفاظ میں ہے۔چونکہ پچھلی سورت یعنی فرقان میں ان باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی جو قرآن کریم اپنے متبعین کے اندر پیدا کرتا ہے تو ان تینوں سورتوں میں سلسلہ موسوی کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ ضرور ہے کہ یہ پیغام حق دنیا میں کامیاب ہو۔جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کامیاب ہوئے اور مخالفین تباہ ہوئے۔جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین تباہ ہوئے بلکہ اس شدید مشابہت کے لحاظ سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے،ضرور تھا کہ تاریخ اسرائیل کے واقعات تاریخ اسلام میں دہرائے جاتے۔اور ان تینوں سورتوں میں تاریخ اسرائیل کے انہی واقعات کا بالخصوص ذکر کیا ہے جو تاریخ اسلامی میں دہرائے جانے والے تھے۔چنانچہ اس سورت میں فرعون کے مقابلہ اور اس کی ہلاکت کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔سورۂ النمل میں اس شان و شوکت کا ذکر کیا ہے جو آخر کار سلسلہ اسرائیلی کو ملی۔سورۂ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر ہے اور یہ تمام باتیں اسی طرح پر تاریخ اسلام میں دہرائی گئیں۔

زمانۂ نزول:

یہ تینوں سورتیں مکی ہیں اور غالباً مکہ کے آخری ایام کی ہیں۔بالخصوص اس مجموعہ کی آخری سورت میں جو ہجرت کے بعد مکہ میں واپس لانے کا ذکر ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں اس زمانہ کی ہیں جب ہجرت شروع ہو چکی تھی۔

2401- ﴿طٰسٓمّٓ﴾ یہ تین سورتوں کا ایک مجموعہ ہے۔یعنی سورۂ شعراء اور قصص جو ﴿طٰسٓمّٓ﴾ سے شروع ہوتی ہیں اور نمل جو ﴿طٰسٓ﴾ سے شروع ہوتی ہے۔محمد بن کعب سے ہے کہ طا سے مراد ذِی الطَّوۡلِ ہے اور س سے قُدُّوۡسٌ اور م سے رَحۡمٰنٌ۔(ر) لیکن اگر اسمائے الٰہی کا ان حروف کو قائم مقام سمجھا جائے تو س اور م سے مراد سمیع اور علیم ہو سکتا ہے جو دو اسماء اکثر اکٹھے آتے ہیں۔لیکن جب ان تینوں سورتوں کے مضمون پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تینوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے سلسلہ کی طرف خصوصاً توجہ دلائی ہے۔جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر روشنی پڑتی ہے۔یعنی صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحی جو طور سینا پر موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی قرآن کریم کے لیے بطور تمہید کے تھی۔چنانچہ اس مضمون کو کھول کر اس مجموعہ کی آخری سورۃ القصص

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲

یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳

شاید تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔ (2402)

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝۴

اگر ہم چاہیں ان پر آسمان سے ایک نشان اتاریں تو ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔ (2403)

میں بیان کیا ہے اور اس کے پانچویں رکوع میں نہایت صفائی سے یہ ذکر ہے۔ اس لیے ان حروف میں اشارہ اسی وحی کی طرف معلوم ہوتا ہے جو طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور طا سے مراد طور، س سے مراد سینا، م سے مراد موسیٰ ہے۔ گویا فرمایا ہے کہ اگر اس کتاب کی صداقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس وحی پر غور کرو جو موسیٰ علیہ السلام پر طور سینا پر نازل ہوئی۔

2402- **مخالفین کی ہلاکت کی خبر سے آنحضرت ﷺ کا غم:** آپ کو نذیر کر کے بھیجا گیا۔ آپ کا فرض تھا کہ بتاتے کہ بدی کا انجام دکھ ہے۔ قرآن کریم میں بار بار سخت وعید نازل ہوتے تھے۔ آپ ان کو اپنے فرض منصبی کے لحاظ سے پہنچاتے تھے۔ مگر دل غم سے بھرا ہوا تھا اور تڑپ یہ تھی کہ کسی طرح ایمان لائیں اور نیک بنیں تا کہ عذاب ٹل جائے۔ یہی آپ کی تڑپ تھی جس نے آخر اس قوم کا سر اسلام کے سامنے جھکا دیا۔ یہی خوش خبری ہے جو اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ وہ آیت مخالفت کی کمر ہمت کا ٹوٹ جانا تھا۔ جس کے بعد عرب کی گردنیں اسلام کے آگے جھک گئیں۔

2403- اَعْنَاقُ۔ عُنُق کی جمع ہے، گردن اس کے معنی ہیں۔ ﴿اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ [بني إسرائيل: 13:17] ''عملوں کو اس کی گردن میں ڈالا۔'' ﴿فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝۳۳﴾ [صٓ: 33:38] ''تب وہ اس کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔'' اور اشراف قوم کو بھی اعناق کہتے ہیں اور یہی معنی یہاں ہیں۔ (غ) اور یہ اسی طرح ہے جیسے وجوہ بڑے آدمیوں کو کہہ دیتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے یعنی مراد اس سے اشراف قوم ہیں کہ اعناق کے لیے خٰضِعِيْنَ آیا ہے۔ اور اگر اعناق کے عام معنی بھی لیے جائیں تو مراد پھر بھی اصحاب اعناق ہیں۔ کیونکہ جب گردنیں جھکیں تو گردنوں والے ہی جھکے۔ (ل) ابن جریر میں بھی یہ قول موجود ہے کہ اعناق سے مراد سادات اور کبرا ہیں۔

﴿خٰضِعِيْنَ﴾۔ خَضَعَ (مصدر خضوع) کے معنی ہیں جھک گیا، فرمانبردار ہوا۔ اور [خَضَعَ الرَّجُلَ] کے معنی ہیں عورت سے کلام میں ملائمت کا خاص انداز اختیار کیا۔ (ل) یعنی ایسا انداز جس سے مرد کو عورت کی طرف رغبت پیدا ہو۔ ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ [الأحزاب: 32:33] ''سو نرم آواز میں بات نہ کرو، سو ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہو وہ طمع کرے۔''

وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝۵

اوران کے پاس رحمٰن کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی، مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶

انہوں نے تو جھٹلا دیا، پس ان کے پاس اس کی حقیقت آجائے گی جس سے ہنسی کرتے تھے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۷

کیاانہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا اس میں ہم نے کتنے ہر قسم کے عمدہ جوڑے اگائے ہیں۔ (2404)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸

یقیناً اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

ع 1 9 5 وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۹

اور تیرا رب بے شک وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔ (2405)

2404- کریم ہر شے سے اشراف کو کہا جاتا ہے اور مراد یہاں منفعت والی اشیاء ہیں کہ ان سب کے جوڑے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ اور اگلی آیت میں جو فرمایا کہ **زمین میں ہر قسم کے ازواج پیدا کرنے میں بھی ایک نشان ہے**، تو وہ نشان صرف یہی نہیں کہ انسان سب سے اشرف ہے، وہ اپنے آپ کو کیوں ذلیل کر رہا ہے۔ بلکہ اس کی تصریح دوسری جگہ فرمائی ہے: ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۴۹ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ [الذاریات: 49:51, 50] ''اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ سو اللہ کی طرف دوڑو۔'' یعنی جب ہر چیز کے ازواج ہیں یہاں تک کہ سماء اور ارض بھی دو زوج ہیں جیسا کہ وہیں فرمایا ہے تو انسان کے اندر جو قویٰ دیگر حیوانات سے بڑھ کر رکھے گئے ہیں ان کا نشوونما صحیح طریق پر بغیر کسی زوج سے تعلق کے کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اور اس سورت میں یہ تعلق باللہ ہے جو انسان کے قوائے روحانی کی نشوونما کرتا ہے۔ یہی وہ نشان ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے اور اسی لیے اگلے رکوعوں میں انبیاء کا ذکر کر کے جو تعلق باللہ پیدا کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کا ذکر کر کے یہ لفظ ہر بار دہرائے ہیں۔

2405- ان دو صفات کے انتخاب میں یہ اشارہ ہے کہ **مخالفین حق پر اللہ غالب آتا ہے** مگر نہ ان کی بیخ کنی کے لیے بلکہ ان پر رحم کرنے کے لیے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے زیادہ غم نہ کریں، اللہ تعالیٰ غلبہ کے بعد ان سے رحم

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾

اور جب تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ ظالم قوم کے پاس جا۔

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾

فرعون کی قوم (کے پاس) کیا وہ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۫﴿۱۲﴾

اس نے کہا میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں۔

وَ يَضِيْقُ صَدْرِيْ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور میرا سینہ رکتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ تو ہارون کی طرف (میری مدد کے لیے) پیغام بھیج۔ (2406)

وَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۚ﴿۱۴﴾

اور وہ میرے ذمے ایک قصور دھرتے ہیں، سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔ (2407)

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾

کہا ہرگز نہیں، سو دونوں ہمارے نشانوں کے ساتھ جاؤ ہم تمہارے ساتھ سننے والے ہیں۔

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۶﴾

سو فرعون کے پاس دونوں جاؤ اور کہو ہم جہانوں کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (2408)

کا معاملہ کرے گا۔

2406- يَنْطَلِقُ۔ [طَلِقُ اللِّسَانِ] فصیح کو کہتے ہیں۔ اور اِنْطِلَاقٌ کے معنی [سُرْعَةُ الذَّهَابِ] ہیں، یعنی تیز چلنا۔ (ل)

2407- یہ قصور قبطی کا قتل تھا جس کا مفصل ذکر سورۂ قصص میں ہے اور یہاں بھی آگے کچھ ذکر آتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ واقعی قصور کیا تھا بلکہ یہ کہ ان کا دعویٰ میرے خلاف ایسا ہے۔

2408- دوسری جگہ ہے ﴿اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ﴾ [طٰہٰ: 47:20] ''ہم تیرے رب کے دو رسول ہیں۔'' یہاں واحد اختیار کیا ہے یعنی ہم میں سے ہر ایک رسول ہے۔ اور رسول کا استعمال واحد جمع میں یکساں بھی ہو جاتا ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ (فرعون نے) کہا، کیا ہم نے تجھے اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا اور تو ہمارے اندر اپنی عمر کے (کئی) سال رہا۔

وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ اور تو نے اپنا وہ کام کیا جو کیا، اور تو ناشکر گزاروں میں سے ہے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ کہا میں نے اسے اس حال میں کیا جبکہ میں ناواقفوں میں سے تھا۔ (2409)

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ سو میں تم سے بھاگ گیا جب میں تم سے ڈرا، سو میرے رب نے مجھے فہم عطا فرمایا اور مجھے رسولوں میں سے بنایا۔

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ اور یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔ (2410)

قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ فرعون نے کہا اور جہانوں کا رب کون ہے؟

2409- پچھلی آیت میں كَافِرٌ سے مراد کافر نعمت ہے اور یہاں ضَآلٌّ سے مراد جاہل ہے۔ اور عرب [جَهْلَ الطَّرِيْقَ] اور [ضَلَّ الطَّرِيْقَ] ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ (ج) اور جاہل سے مراد اس فعل کے نتیجہ سے ناواقف ہے۔ کیونکہ آپ کا ارادہ قتل تو نہ تھا بلکہ صرف مکا مارنا تھا ﴿فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى﴾ [القصص: 15:28] ''پس موسیٰ نے اسے ایک مکا مارا'' اور یہ انہیں کس طرح خبر ہو سکتی تھی کہ ایک مکے سے ایک شخص مر جائے گا۔ اور اگلی آیت میں جو خِفْتُكُمْ فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ تمہارے ظلم کا خوف تھا اس لیے کہ جو شخص مارا گیا وہ قبطی تھا اور دوسری قوم کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی توقع نہ تھی کہ آپ کے ساتھ اس معاملہ میں انصاف ہوگا۔

2410- ﴿عَبَّدْتَّ﴾ کے معنی ہیں اے عبد، یعنی غلام بنالیا۔ (غ) یعنی ایک میرے پالنے کا تم احسان جتاتے ہو اور ساری قوم کو تم نے غلام بنا رکھا ہے۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾

کہا آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

(فرعون نے) انہیں جو اِرد گرد تھے کہا، کیا تم سنتے نہیں۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

(موسیٰؑ نے) کہا تمہارا رب اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا رب۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

(فرعون نے) کہا تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، یقیناً مجنون ہے۔[2411]

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

(موسیٰ نے) کہا مشرق اور مغرب کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اگر تم عقل سے کام لو۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾

(فرعون نے) کہا اگر تو میرے سوا کوئی دوسرا معبود بنائے گا تو میں تجھے قیدیوں میں داخل کر دوں گا۔

قَالَ اَوَ لَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

کہا بھلا اگر میں تیرے پاس کوئی کھلی بات لاؤں!

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

کہا تو وہ لے آ اگر تو سچا ہے۔

2411- مجنون اس لیے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کی پروانہ کر کے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ذکر جاری رکھا اور یوں بھی انبیاء کو بوجہ اس جوش کے جو انہیں حق کے لیے دیا جاتا ہے کہ وہ بالمقابل کسی طاقت کی پروانہیں کرتے دنیا کے لوگ مجنون سمجھتے ہیں۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾

پس اپنا عصا ڈالا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ صریح اژدھا ہے۔(2411)

وَ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ ع 2 24 6

اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

(فرعون نے) اپنے ارد گرد کے سرداروں سے کہا یہ علم والا جادوگر ہے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے۔ سو تم کیا مشورہ دیتے ہو۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ ابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾

انہوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں نقیب بھیج دے۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

وہ ہر ایک علم والے جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾

سو جادوگر ایک مقررہ دن کے وعدے پر جمع ہو گئے۔

وَّ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور لوگوں کو کہا گیا کیا تم جمع ہو گئے۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾

شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غالب رہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

سو جادوگر آ گئے، انہوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لیے کچھ اجر ہے اگر ہم غالب رہیں۔

2411(ل)۔ ﴿ثُعْبَانٌ﴾۔ ثَعَبَ پانی یا خون جاری کیا۔ اور ثُعْبَانٌ بہت موٹے اور لمبے سانپ کو کہتے ہیں، اور بعض کے نزدیک ہر سانپ کو۔(ل)

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہا ہاں اور تم اس صورت میں میرے مقربوں میں سے ہو گے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾

موسیٰ نے ان سے کہا ڈالو جو تم ڈالتے ہو۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

سو انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب ہوں گے۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾

تب موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا، تو جو وہ جھوٹ بناتے تھے وہ اسے نگلنے لگا۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

پس جادوگر سجدے میں گر گئے۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

انہوں نے کہا ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾

موسیٰ اور ہارون کے رب (پر)۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

(فرعون نے) کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔ یقیناً یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، سو تم جان لو گے۔ میں تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دوں گا، اور میں تم سب کو صلیب دے دوں گا۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾

انہوں نے کہا کچھ حرج نہیں ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (2412)

2412- ﴿ضَيْرَ﴾ کے معنی مضرت ہیں۔ (غ) ان تمام امور پر پہلے مفصل بحث گزر چکی ہے۔

إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ أَنْ كُنَّآ أَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥١﴾ ع 3 18 7

ہم آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطائیں ہمیں بخش دے کہ ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

وَ أَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوْسٰى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْٓ إِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿٥٢﴾

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے جا کیونکہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿٥٣﴾ ج

تو فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے۔

إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿٥٤﴾ لا

کہ یہ تھوڑی سی جماعت ہے۔(2413)

وَ إِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿٥٥﴾ لا

اور وہ ہمیں غصے میں لانے والے ہیں۔

وَ إِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿٥٦﴾ ط

اور ہم ایک محتاط جماعت ہیں۔(2414)

فَأَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿٥٧﴾ لا

سو ہم نے انہیں باغوں اور چشموں سے نکال دیا۔

2413- ﴿لَشِرْذِمَةٌ﴾ ایک منقطع کی ہوئی جماعت۔(غ) یا تھوڑی جماعت اور [ثِيَابٌ شَرَاذِمُ] پرانے پھٹے ہوئے کپڑوں کو کہتے ہیں۔(ل) (شَرَاذِمُ جمع شِرْذِمَةٌ ہے) اور کہا گیا ہے کہ شِرْذِمَةٌ سفلہ یا خسیس لوگوں کو کہتے ہیں۔(ل) اور چونکہ قَلِيْلُ کا لفظ موجود ہے اس لیے یہی آخری معنی ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ اور [ثِيَابٌ شَرَاذِمُ] کا محاورہ ان کی تائید کرتا ہے۔

2414- لَجَمِيْعٌ۔ جَمَعَ اور جَمِيْعٌ اور جَمَاعَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ سب کے سب۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ **فرعون نے بنی اسرائیل کو بالکل تباہ کر دینے کی ٹھان لی تھی**۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ہم محتاط لوگ ہیں یعنی قبل اس کے کہ بنی اسرائیل ہماری برابری کا دعویٰ کریں اور معزز بن جائیں ہمیں ان کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ دوسری جگہ ہے: ﴿وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝﴾ [القصص: 6:28] ''اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو ان سے وہ چیزیں دکھائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔'' غصہ دلانے سے مراد یہ ہے کہ ہم بڑے لوگ ہیں یہ ایک **ماتحت اور ذلیل** قوم ہو کر جب ہماری برابری کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں وحی کا ذکر پہلے ہے، تو وحی اور چیز ہے اور بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا اور چیز۔ یہ مطلب نہیں کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل پڑے تو فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے۔ بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی پہلے سے اطلاع دے دی تھی کہ اب فرعون ایسا کام کرنے والا ہے کہ سوائے اس کے کہ بنی اسرائیل کو رات کو پوشیدہ طور نکال لیا جائے اور چارہ نہیں۔

وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾

اور خزانوں اور عزت والے مقام سے۔

كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

ایسا ہی (اب ہوگا) اور ان (چیزوں) کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔ (2415)

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾

سو انہوں نے سورج نکلتے ان کا پیچھا کیا۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

پس جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾

(موسیٰ نے) کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے وہ مجھے رستہ دکھائے گا۔

فَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾

سو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنے عصا سے سمندر کو مار۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر ایک فریق ایک بڑے تودہ کی طرح تھا۔ (2416)

2415- ﴿اَوْرَثْنٰهَا﴾ سے مراد ہے کہ باغوں اور خزانوں کا وارث، نہ فرعون کے باغوں اور خزانوں کا۔ اس لیے کہ جب وہ غلامی سے نکل کر آزاد ہو گئے تو باغ اور خزانے اور عزت کا مقام مل گیا۔ اور بعض نے یہ مراد لی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں مصر پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے۔

2416- ﴿اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ کے معنی کے لیے دیکھو ﴿اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ پر [نمبر: 88]۔ علاوہ اس معنی کے جو ترجمہ میں ہیں یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اپنے عصا کے ساتھ سمندر میں چل پڑ یا اپنی جماعت کے ساتھ چل پڑ۔ اس کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے: ﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا﴾ [طٰہٰ: 77:20] ''پھر انہیں سمندر میں خشک رستہ پر جلد لے جا۔''

﴿فَانْفَلَقَ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 73] اور صبح کے نمودار ہونے پر بھی فَلَقٌ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ تاریکی سے روشنی الگ ہو جاتی ہے۔ سمندر کا پھٹنا یہی ہے کہ پانی ہٹ کر پیچھے ہو گیا۔

﴿فِرْقٍ﴾ الگ ہوئے ہوئے ٹکڑے کو کہا جاتا ہے۔ اور فِرْقَةٌ اس جماعت کو جو باقی لوگوں سے الگ ہو جائے۔ (غ) اور فِرْقٍ کے معنی قسم بھی ہیں، اور لوگوں کے ایک گروہ کو بھی کہتے ہیں۔ (ل) اور فریق بھی اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ

وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ اور وہیں ہم دوسروں کو قریب لے آئے۔

وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے ساتھ تھے ان سب کو نجات دی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

ع 4 17 8 وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾ اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

ہو: ﴿فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝﴾ [الشوریٰ: 7:42] ''ایک گروہ بہشت میں ہوگا اور ایک گروہ دوزخ میں۔''

﴿كَالطَّوْدِ﴾۔ طَوْد بڑے پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور پشتہ یا تودہ کو بھی۔ اور ایک شعر میں اونٹوں کے کوہانوں کو اَطْوَادٌ کہا گیا ہے۔ (ل) اور طَوْد کا بڑا ہونا طُوْر ہونے کے لحاظ سے ہے۔ سب پہاڑوں میں بڑا ہونا مراد نہیں۔ (غ)

بارہ رستوں کا خیال بے بنیاد ہے:

سمندر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رستہ ملنے کے متعلق مفصل [نمبر: 73] میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں سے مفسرین نے بارہ رستے نکالے ہیں۔ حالانکہ یہاں بارہ رستوں کا ذکر نہیں، نہ کسی حدیث میں ہے۔ اور ﴿كُلُّ فِرْقٍ﴾ سے مراد پانی کے قطعات بھی ہو سکتے ہیں۔ اور دونوں فریق یا جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور اس دوسری صورت میں مراد یہ ہوگی کہ فرعون کے پہنچتے پہنچتے بنی اسرائیل سمندر کو عبور کر گئے اور سمندر کے دونوں کناروں پر یہ دونوں جماعتیں بڑے تودہ کی طرح نظر آنے لگیں۔ اور ﴿وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۝﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر فرعون نے وہی رستہ لیا جس پر بنی اسرائیل چلے تھے۔ نپولین بونا پارٹ کی لائف میں مَیں نے ایک واقعہ پڑھا ہے۔ بعینہٖ بحیرہ قلزم کے اسی مقام پر جب جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر پیچھے ہٹا ہوا تھا غروب آفتاب کے وقت نپولین اپنے ساتھیوں سمیت داخل ہوا، ادھر تاریکی شروع ہوئی اور پانی چڑھنا شروع ہوا یہاں تک کہ رستہ ملنا محال ہو گیا۔ آخر نپولین نے چاروں طرف چند آدمی روانہ کیے اور جدھر جدھر پانی گہرا ہوتا گیا اس طرف سے رخ ہٹا کر اس جانب کا رخ کیا جدھر پانی کم ہوتا چلا گیا۔ اگر یہ تجویز نہ سوجھتی تو لشکر سمیت غرق ہو جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ جوش تعاقب میں فرعون نے چڑھائی کے وقت خیال نہ کیا ہو اور ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے اعجازی طور پر سمندر نے رستہ دے دیا اور فرعونی وہاں غرق ہو گئے۔

وقف لازم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾	اور ان پر ابراہیمؑ کی خبر پڑھ۔(2417)
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾	جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا تم کس کو پوجتے ہو۔
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾	انہوں نے کہا ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور انہی کی عبادت میں لگے رہیں گے۔
قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾	کہا کیا یہ تمہاری (بات) سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو۔
اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾	یا تمہیں فائدہ پہنچاتے ہیں یا نقصان دے سکتے ہیں۔
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾	انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی کرتے پایا۔
قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾	کہا کیا تم دیکھتے ہو کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو۔
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾	تم اور تمہارے پہلے باپ دادا۔
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾	تو وہ میرے لیے دشمن ہیں، مگر جہانوں کا رب۔(2418)
الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾	جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی مجھے ہدایت دیتا ہے۔
وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾	اور جو مجھے کھلاتا اور مجھے پلاتا ہے۔

2417- اس سورت میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ اصل مقصود وہی ہے جیسا کہ ﴿طٰسٓمّٓ﴾ کی تشریح میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتے ہیں۔ اس کے بعد چند انبیاء کا ذکر کیا جو عرب کے اردگرد آئے جن کے دشمنوں کو ہلاک کیا گیا اور وہ ترتیب تاریخی سے ہے۔ یعنی اول نوح علیہ السلام، پھر ہود علیہ السلام، پھر صالح علیہ السلام، پھر لوط علیہ السلام، پھر شعیب علیہ السلام۔

2418- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کو دشمن کہنا اس لحاظ سے تھا کہ وہ بت پرستی کو مٹانے آئے تھے۔

وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ اور جب میں بیمار ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔

وَ الَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۱﴾ اور جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا۔

وَ الَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۸۲﴾ اور جو میں امید رکھتا ہوں کہ میری خطائیں جزا و سزا کے دن معاف کرے گا۔ (2419)

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ میرے رب مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے صالح لوگوں کے ساتھ ملا۔

وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ اور میرے لیے پچھلوں میں ذکر خیر جاری رکھ۔ (2420)

وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں بنا۔

وَ اغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ اور میرے بزرگ کو معاف فرما، وہ گمراہوں میں سے ہے۔

وَ لَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ اور مجھے اس دن رسوا نہ کیجیو جس دن (لوگ) اٹھائے جائیں گے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ جس دن نہ مال نفع دے گا اور نہ بیٹے۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾ مگر جو سلامتی والے دل کے ساتھ اللہ کے حضور آئے۔ (2421)

2419- ﴿خَطِيْٓـَٔتِيْ﴾۔ خَطِيْٓـَٔة کا لفظ وسیع ہے [دیکھو نمبر: 105]۔ بھول کر جو غلطی ہو جائے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ حالانکہ وہ گناہ نہیں۔ **اس قسم کی غلطی عصمت انبیاء کے منافی نہیں** بلکہ تقاضائے بشریت ہے۔ اس معنی میں حضرت مسیح نے کہا تھا ''تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے، نیک سوائے خدا کے کوئی نہیں۔'' کیونکہ ہر بشر سے غلطی ہو سکتی ہے۔

2420- ﴿الْاٰخِرِيْنَ﴾ سے مراد یہاں بعض کے نزدیک آخری امت ہے۔ (ر) یعنی خاتم النبیین کی امت جس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور درود شریف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

2421- ﴿سَلِيْمٍ﴾۔ تمام آفات باطنی سے محفوظ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے بچاؤ اور نجات کے لیے مال اور اولاد کام نہیں آئیں

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ اور جنت کو متقیوں کے لیے قریب کیا جائے گا۔

وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ اور دوزخ گمراہوں کے لیے ظاہر کیا جائے گا۔

وَ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ اور انہیں کہا جائے گا وہ کہاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے تھے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ اللہ کے سوائے، کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں یا بدلہ لے سکتے ہیں۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ سو وہ اور گمراہ کرنے والے اس میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ (2422)

وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب۔

قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ کہیں گے اور وہ اس میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔

گے۔ مگر قلب سلیم کام آئے گا۔

2422- ﴿فَكُبْكِبُوْا﴾۔ كَبّ کسی چیز کا منہ کے بل گرانا ہے: ﴿فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ [النمل: 90:27] ''تو وہ اوندھے منہ آگ میں ڈالے جائیں گے۔'' اور اِكبَابٌ یہ ہے کہ عمل پر کسی شخص کا منہ اوندھا رہے۔ ﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ﴾ [الملك: 22:67] ''تو کیا وہ جو اپنے منہ کے بل چلتا ہے۔'' اور كَبْكَبَةٌ کسی چیز کا گہرائی میں پھینکنا ہے۔ (غ) اور اس کی حقیقت لغت میں یہ ہے کہ اِنْكِبَابٌ یعنی اوندھا پھینکنے کو بار بار کیا جائے۔ (ل)

یہاں تین گروہ ہیں۔ ﴿هُمْ﴾ ﴿الْغَاوٗنَ﴾ ﴿جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ﴾ (جو اگلی آیت میں مذکور ہے) ظاہر ہے کہ آخری لفظ سے شیاطین کا گروہ مراد ہے جو بدی کے محرک ہیں۔ اور غَاوِیْ یا گمراہ کرنے والے لوگ سردار ہیں جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور ﴿هُمْ﴾ سے مراد ان کے متبعین ہیں۔ ﴿جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ﴾ کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر انسان کے لیے ابلیس کی کوئی الگ ہستی ہے اور یہ حدیث کے مطابق ہے۔ اور یہاں بتوں کے آگ میں ڈالنے کا کوئی ذکر نہیں۔

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اللہ کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے۔

اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ جب ہم تمہیں جہانوں کے رب کے برابر کرتے تھے۔ (2423)

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ اور ہمیں گمراہ نہیں کیا مگر مجرموں نے۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ پس ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔

وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ اور نہ کوئی غم کھانے والا دوست ہے۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ سو کاش اگر ہمارے لیے لوٹ جانا ہوتو ہم مومنوں میں سے ہوں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ ع 5 36 9 اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ نوحؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ جب ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

2423- اوپر کے نوٹ سے ظاہر ہے کہ یہ جنہیں رب العالمین کے برابر بنانے کا ذکر ہے وہی ان کے گمراہ کنندہ ہیں۔ کیونکہ ان کے احکام کو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرح مانتے تھے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ اور میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾ سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ انہوں نے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں اور تیرے پیرو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اس نے کہا اور مجھے کیا علم ہے وہ کیا کرتے ہیں۔

اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ ان کا حساب صرف میرے رب کا کام ہے، کاش تم سمجھو۔

وَ مَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اور میں مومنوں کو حقیر سمجھ کر نکالنے والا نہیں ہوں۔ (2424)

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾ میں صرف کھول کر ڈرانے والا ہوں۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ انہوں نے کہا اے نوح! اگر تو نہ رکا تو ضرور تجھے سنگسار کیا جائے گا۔

النصف قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ اس نے کہا اے میرے رب میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔

فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ سو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر اور مجھے اور انہیں جو مومنوں میں سے میرے ساتھ ہیں نجات دے۔

2424- طَارِدِ۔ طَرْد استخفاف کر کے یعنی حقیر سمجھ کر دھتکار دینا اور دور کر دینا ﴿وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ﴾ [الأنعام: 52:6] ''اور ان کو نہ نکال۔'' (غ)

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾

سو ہم نے اسے اور انہیں جو اس کے ساتھ تھے بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔ (2425)

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾

اس میں ایک نشان ہے، اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ ع 6 18 10

اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

جب ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾

میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾

سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔

وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور میں تم سے اس پر اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

کیا تم ہر اونچی جگہ پر یادگاریں بناتے ہو عبث کام کرتے ہو۔ (2426)

2425- اَلْمَشْحُوْنِ۔ شَحْن کے معنی ہیں کشتی کا بھرنا اور اس کے سامان کا تیار کرنا۔ (ل) اور شَحْنَآء اس دشمن کو کہتے ہیں جس سے نفس بھر جائے۔ (غ)

2426- ﴿رِيْعٍ﴾۔ رِيْعَة کی جمع ہے۔ ہر ایک اونچی جگہ جو دور سے نظر آئے۔ (غ) اور رستہ اور وادی بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں۔

وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾	اور کاریگری کے کام بناتے ہو کہ شاید تم ہمیشہ رہو۔ (2427)
وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴿۱۳۰﴾	اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو تو سختی سے پکڑتے ہو۔ (2428)
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾	سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔
وَ اتَّقُوا الَّذِیْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾	اور اس کا تقویٰ کرو جس نے ان چیزوں سے تمہاری مدد کی ہے جو تم جانتے ہو۔
اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِیْنَ ﴿۱۳۳﴾	چار پایوں اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی ہے۔
وَ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾	اور باغوں اور چشموں سے۔

(ج) اٰیَةً یہاں بلند عمارت ہے۔ [دیکھو نمبر: 60]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ **بلند عمارتیں** صرف بڑے بڑے آدمیوں کی یادگاروں کے طور پر بنائی جاتی تھیں۔ اس لیے ان کو اٰیَةً یا نشان کہا ہے۔ اور ان کی غرض صرف اپنے نام کی بڑائی اور نمود تھی۔

2427- مَصَانِعَ۔ صَنَعَ [دیکھو نمبر: 1968]۔ مَصَانِعَ سے مراد ہے جو وہ بناتے تھے۔ اور اعلیٰ درجہ کے مکانوں کو بھی مَصَانِعَ کہتے ہیں۔ (غ) اور مَصْنَعَة اور صِنع حوض کو کہتے ہیں یا تالاب، بند وغیرہ کو جس میں بارش کا پانی جمع کیا جائے۔ اور عمارتوں کو جو لوگ بنائیں اور محلات کو بھی اور مَصَانِعَ جمع ہے۔ (ل) اور مفسرین کے بھی اس میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض بڑی بڑی عمارتیں مراد لیتے ہیں، بعض قلعے، بعض محلات، بعض پانی کے تالاب۔ ابن جریر کہتے ہیں یہ لفظ ان سب پر حاوی ہے اور وسیع معنی میں لیا جا سکتا ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کی کاریگری کے کام بڑی عمارات ہوں یا قلعے یا پانی کے تالاب، کوئی معیوب امر نہیں۔ بلکہ معیوب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بالکل بھول گئے اور انہی چیزوں کو اپنی طاقت کا اصل موجب سمجھا۔ اس لیے فرمایا کہ یہ چیزیں تم کو باقی نہیں رکھ سکتیں اگر خدا کو منظور نہ ہو۔

2428- ﴿بَطَشْتُمْ﴾۔ بَطْش حملہ کر کے کسی چیز کا لے لینا ہے۔ ﴿وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا﴾ [القمر: 36:54] ''اور اس نے انہیں ہماری گرفت سے ڈرایا تھا'' ﴿یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰی﴾ [الدخان: 16:44] ''جس دن ہم سخت گرفت میں پکڑیں گے۔'' (غ)

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾

میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب (کے آنے) سے ڈرتا ہوں۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

انہوں نے کہا ہمارے لیے برابر ہے، خواہ تو وعظ کرے یا تو وعظ کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

یہ (اور) کچھ نہیں مگر پہلوں کا (بنایا ہوا) جھوٹ ہے۔ (2429)

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور ہم عذاب نہیں دیئے جائیں گئے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

سو انہوں نے اسے جھٹلایا پس ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ ع 7 18 11

اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾

جب ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

2429- خُلُقُ۔ خَلْق جہاں جہاں کلام کے وصف میں استعمال کیا گیا ہے تو اس سے مراد کذب یعنی جھوٹ ہے۔ اور اسی لیے بہت سے لوگوں نے لفظ **خَلْق کے قرآن کریم پر اطلاق سے منع کیا ہے**۔ اور اسی معنی میں یہاں لفظ خُلُق ہے اور اسی معنی میں اخْتِلَاقٌ ہے۔ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ [صٓ: 7:38] ''یہ صرف بناوٹ ہے۔'' (غ) اور خُلُق اور خُلْق طبیعت یا صورت باطنی کے وصف کو بھی کہتے ہیں۔ ﴿لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ [القلم: 4:68] ''یقیناً تو بلند اخلاق رکھتا ہے۔'' (ل) اور اس لیے اس کے معنی عادت بھی کیے گئے ہیں۔ (ج)

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾	میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾	سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔
وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾	اور میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔
اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۶﴾	کیا تم (چیزوں) میں جو یہاں ہیں امن میں چھوڑ دیئے جاؤ گے۔
فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾	(یعنی) باغوں اور چشموں میں۔
وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ﴿۱۴۸﴾	اور کھیتیوں اور کھجوروں (میں) جن کا گابھا ملائم ہے۔ (2430)
وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴿۱۴۹﴾	اور تم اتراتے ہوئے پہاڑوں میں گھر تراش لیتے ہو۔ (2431)
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾	سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔
وَ لَا تُطِیْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۵۱﴾	اور حد سے بڑھنے والوں کی بات کو نہ مانو۔
الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾	جو زمین میں فساد کرتے ہیں، اور اصلاح نہیں کرتے۔

2430 - ﴿هَضِیْمٌ﴾ [دیکھو نمبر: 2106] اس کے معنی مفسرین نے لطیف اور کثرت پھل سے جھکا ہوا بھی کئے ہیں۔ (ر)

2431 - ﴿فٰرِهِیْنَ﴾۔ فَرِہَ کے معنی اَشِرَ ہیں یعنی اترانے والا اور یہی معنی فَارِہَ کے ہیں اور حاذق بھی معنی کیے گئے ہیں۔ (غ)

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۙ﴿۱۵۳﴾

انہوں نے کہا تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔ (2432)

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾

تو کچھ نہیں مگر ہماری طرح ایک انسان ہے۔ سو کوئی نشان لا اگر تو سچوں میں سے ہے۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۚ﴿۱۵۵﴾

کہا یہ اونٹنی ہے، اس کے لیے پانی کی باری ہے اور تمہارے لیے ایک معلوم وقت پانی کی باری ہے۔ (2433)

وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾

اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا، ورنہ تمہیں ایک بڑے دن کا عذاب آپکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۙ﴿۱۵۷﴾

پس انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے پھر پشیمان ہوئے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾

سو انہیں عذاب نے آپکڑا، اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

2432- ﴿الْمُسَحَّرِيْنَ﴾۔ مُسَحَّرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1839]۔ عام معنی جادو کیا گیا بھی ہیں۔ مگر یہاں ابن جریر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مخلوق معنی کر کے اسی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ ہر ایک کھانے والے پر انسان ہو یا چار پایہ مُسَحَّرٌ بول دیا جاتا ہے۔

2433- ﴿شِرْبٌ﴾۔ شِرْبٌ پینے کا حصہ ہے ﴿كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ [القمر: 28:54] ''ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔'' (غ) ﴿شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ سے مراد مقرر وقت پر پانی لینا ہے گویا وہ معلوم ہے اور یوم سے مراد یہاں عام ہے یعنی وقت۔ ﴿يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک دن اونٹنی کے پانی پینے کے لیے مقرر تھا اور ایک دن ساری قوم کے لیے اور اونٹنی اپنی باری میں سارے شہر کا پانی پی جاتی تھی۔ یہ کہیں قرآن شریف میں ذکر نہیں بلکہ ﴿كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ [القمر: 28:54] ''ہر پینے کی باری پر حاضری ہوگی۔'' سے معلوم ہوتا ہے کہ چشمہ ایک معین وقت پر کھلتا تھا (کیونکہ پہاڑی ملک تھا اور بارش کی کمی سے ایسے مقامات پر پانی کے لیے وقت مقرر کرنا پڑتا ہے) اور مطلب یہ تھا کہ اونٹنی کو پانی پینے سے روکا نہ جائے۔

ع 8 19 12 وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۵۹﴾ — اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطِ ٍۨالۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۶۰﴾ — لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ لُوۡطٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ — جب ان کے بھائی لوطؑ نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۶۲﴾ — میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ ﴿۱۶۳﴾ — سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

وَمَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۴﴾ — اور میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

اَتَاۡتُوۡنَ الذُّكۡرَانَ مِنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۵﴾ — کیا تم تمام جہان سے مَردوں کے پاس جاتے ہو۔(2434)

وَتَذَرُوۡنَ مَا خَلَقَ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ‌ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ عٰدُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾ — اور اسے چھوڑتے ہو جو تمہارے رب نے تمہارے لیے تمہارے جوڑے پیدا کیے۔ بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

قَالُوۡا لَـئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ يٰلُوۡطُ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُخۡرَجِيۡنَ ﴿۱۶۷﴾ — انہوں نے کہا اے لوط! اگر تو باز نہ آیا تو تجھے نکال دیا جائے گا۔

قَالَ اِنِّىۡ لِعَمَلِكُمۡ مِّنَ الۡقَالِيۡنَ ﴿۱۶۸﴾ — اس نے کہا میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں۔(2435)

2434- اگر ﴿مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کو الذُّكۡرَانَ کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی یوں ہوں گے کہ عالمین یعنی خدا کی مخلوق میں سے بجائے عورتوں کے پاس جانے کے تم مردوں کے پاس جاتے ہو۔ اور اگر ﴿مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کو تَاۡتُوۡنَ سے متصل لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم ایک ایسا طریق اختیار کرتے ہو جو کسی قوم نے نہیں کیا۔ یعنی مردوں کے پاس جاتے ہو۔

2435- ﴿الۡقَالِيۡنَ﴾۔ قَلٰی شدت بغض کو کہتے ہیں ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴾ [الضحیٰ: 93:3] ''تیرے رب نے تجھے چھوڑا نہیں

رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

میرے رب مجھے اور میرے اہل کو اس سے نجات دے جو یہ کرتے ہیں۔ (2436)

فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ۙ

سو ہم نے اسے نجات دی اور اس کے اہل کو سب کے سب کو۔

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ۚ

مگر ایک بڑھیا۔ (جو) پیچھے رہ جانے والوں میں سے (تھی)۔ (2437)

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ۚ

پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور ہم نے ان پر ایک مینہ برسایا، سو کیا برا ان کا مینہ تھا جو ڈرائے گئے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾

اس میں ایک نشان ہے، اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ ع 9 16 13

اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ۚۖ

بن کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ۚ

جب شعیبؑ نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔

اور نہ وہ ناراض ہوا۔'' (غ) اور قَالِیْ بغض رکھنے والا۔

2436- یعنی ان کے اعمال بد کے نتائج سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو محفوظ رکھو۔

2437- ﴿عَجُوْزًا﴾ سے مراد ان کی بی بی ہے۔ دوسری جگہ ہے ﴿اِلَّا امْرَاَتَهٗ﴾ [الأعراف: 83:7] ''مگر اس کی عورت۔'' اور اہل میں ان کے اہل بیت اور پیرو سب شامل ہیں۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۷﴾	میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾	سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔
وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾	اور میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔
اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾	ماپ پورا دیا کرو اور کم دینے والوں میں سے نہ بنو۔
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾	اور ٹھیک ترازو سے تولا کرو۔
وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾	اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو، اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔
وَ اتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾	اور اس کا تقویٰ کرو جس نے تمہیں اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا۔ (2438)
قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾	انہوں نے کہا تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔
وَ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾	اور تو کچھ نہیں مگر ہماری طرح ایک انسان ہے اور ہم تجھے جھوٹوں میں سے ہی سمجھتے ہیں۔

2438- ﴿الْجِبِلَّةَ﴾۔ جَبَلَ اللہ کے معنی ہیں اللہ نے اسے خاص طبیعت پر پیدا کیا اور اسی سے جِبِلَّةٌ ہے اور ذُوْ جِبِلَّةٍ بڑے جسم والے کو کہتے ہیں۔ اور جِبِلّ بہت بڑی جماعت کو کہتے ہیں، ﴿وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا﴾ [يٰسٓ: 62:36] ''اور یقیناً اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کیا۔'' اور بعض نے جِبِلّ کو جِبِلَّة کی جمع کہا ہے۔ (غ) اور راغب ﴿الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ﴾ کے معنی کرتے ہیں وہ لوگ جو اپنے احوال پر جن پر وہ بنائے گئے مجبول تھے اور ان رستوں پر مجبول تھے جن پر وہ چلائے گئے۔

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾

سو ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرا دے، اگر تو سچا ہے۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اس نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ (2439)

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

سو انہوں نے اسے جھٹلایا، پس بادل والے دن کے عذاب نے انہیں آپکڑا۔ وہ بڑے دن کا عذاب تھا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

اس میں ایک نشان ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع 10 16 14

اور تیرا رب وہی غالب رحم کرنے والا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾

اور یہ جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾

جبریل امین اسے لے کر اترا ہے۔

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

تیرے دل پر، تا کہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو۔ (2440)

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾

کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان میں۔ (2441)

2439- یعنی جب تمہارے عمل اس حد کو پہنچ جائیں جن پر سزا کا آنا ضروری ہے تو سزا بھی آ جائے گی۔

2440- [دیکھو نمبر: 123] اور ﴿الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ سے مراد جبریل ہونے پر [دیکھو نمبر: 111]، مضمون کا رکوع اول مضمون کی طرف لوٹایا ہے اور بتایا ہے کہ جس قدر ذکر درمیان میں انبیاء کا ہوا وہ سب مثال کے طور پر اور نبی کریم ﷺ کی تسلی کے لیے ہے اور وہی کام جو ان رسولوں کے ایک ایک کر کے سپرد کیا گیا وہ سب کام آپ کے سپرد کیا گیا۔ جب وہ کامیاب ہوئے تو آپ کیوں کامیاب نہ ہوں گے۔

2441- **کلام الٰہی الفاظ میں نازل ہوا:** یہ لفظ بڑھائے ہیں تا کہ اول یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے قلب پر قرآن کے نازل کرنے

وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ اور وہ پہلوں کے صحیفوں میں (موجود) ہے۔ (2442)

اَوَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۷﴾ کیا ان کے لیے یہ نشان نہیں کہ بنی اسرائیل کے عالم اسے جانتے ہیں۔ (2443)

وَ لَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾ اور اگر ہم اسے عجمیوں میں سے کسی پر اتارتے۔

فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ اور وہ اسے ان پر پڑھتا اس پر بھی ایمان نہ لاتے۔ (2444)

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾ اسی طرح ہم نے اسے مجرموں کے دلوں میں داخل کیا ہے۔

سے یہ مراد نہیں کہ اس کے معانی آپ کے قلب پر نازل ہو گئے تھے۔ بلکہ الفاظ اترے ہیں اور دوسرے میں اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اور دیگر ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جن میں ایک نبی کے عرب میں آنے کا ذکر تھا اور یوں اس آیت کا تعلق پچھلی آیات سے بھی ہے۔ اور اگلی آیت سے بھی جس میں یہ ذکر ہے کہ قرآن کریم کی پیشگوئیاں سب پہلے صحیفوں میں تھیں۔

2442- **پہلے صحیفوں میں آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشگوئیاں:** پہلوں کے صحیفوں میں موجود ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئیاں پہلی کتابوں میں موجود ہیں۔ (ج) اور یہ خیال کہ صرف بعض صحیفوں میں یہ پیشگوئیاں ہیں، صحیح نہیں۔ بلکہ آپ کی پیشگوئیاں تو کل انبیاء نے کیں۔ ہاں جس طرح بعض کے صحیفے ہی دنیا سے نابود ہو گئے، بعض میں سے یہ پیشگوئیاں بھی جاتی رہیں مگر اب تک بھی بالخصوص مجموعہ بائبل ان پیشگوئیوں سے بھرا پڑا ہے۔

2443- علمائے بنی اسرائیل کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔ اس لیے کہ جس قدر پیشگوئیاں بائبل میں ہیں اور کسی کتاب میں نہیں۔ علمائے بنی اسرائیل انہیں جانتے تھے، اب بھی جانتے ہیں۔ خواہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ بعض ان میں سے ایمان بھی لائے جیسے ہمارے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔

2444- **عربی میں قرآن کا نزول:** اس لیے کہ یہ حکمت الٰہی کے خلاف تھا جس حکمت کے مطابق پیشگوئیوں میں بھی اس کا عربی ہونا ظاہر کیا جا چکا تھا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام چونکہ ہر قسم کی خوبیوں کو کیا ظاہری اور کیا باطنی اپنے اندر جمع کرنے والا تھا اس لیے اس کے لیے زبان بھی عربی ہی ہو سکتی تھی، جو ان خوبیوں کو اپنے اندر جمع کر سکے۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کوئی زبان عربی کو نہیں پہنچتی اور جس قدر اس کے الفاظ میں معانی جمع ہو جاتے ہیں دوسری کوئی زبان اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾

وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔ (2445)

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

سو وہ ان پر اچانک آجائے گا اور انہیں خبر نہ ہوگی۔

فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

تب کہیں گے، کیا ہمیں مہلت دی جائے گی۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

تو کیا ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

تو کیا تو نے دیکھا اگر ہم انہیں سالوں تک فائدہ اٹھانے دیں۔

ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

پھر ان کے پاس وہ آجائے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾

تو جس سامان سے فائدہ اٹھاتے رہے ان کے کسی کام نہ آئے گا۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾

اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہیں کی، مگر اس کے لیے ڈرانے والے تھے۔

ع ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

یاد دلانے کے لیے، اور ہم ظالم نہیں ہیں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾

اور شیطان اسے لے کر نہیں اترے۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾

اور یہ ان کے مناسب حال نہیں اور نہ وہ کر سکتے ہیں۔

2445- مجرم وہ ہے جس نے جناب الٰہی سے قطع تعلق کر لیا ہو اور حق کے مقابلہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایسے شخص کو کوئی دلیل کام نہیں دیتی، اس لیے جو شخص مجرم بنتا ہے اس کے لیے یہی قانون ہے کہ سوائے **عذاب دیکھنے کے ایمان نہیں لاتا۔**

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾	وہ (وحی الٰہی کے) سننے سے دور کر دیئے گئے ہیں۔ (2446)
فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾	سو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہ پکار، ورنہ تو عذاب پانے والوں میں سے ہوگا۔
وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾	اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا۔ (2447)

2446- نبی کریم ﷺ کو مفتری کہنے والے بہت ہی کم سیاہ باطن تھے۔ کیونکہ وہ آپ کے حالات سے واقف تھے اور آپ کی راستبازی اور نیکی کا ان میں شہرہ تھا۔ آج بھی یہی حال ہے کہ کروڑوں دشمنوں میں سے سینکڑوں بھی نہیں جو آپ کے حالات کا سرسری علم رکھتے ہوئے بھی آپ کو مفتری کہہ سکیں۔ حتی کہ عیسائی پادری بھی اپنا رویہ بدلتے جا رہے ہیں۔ **اس وقت بھی آپؐ پر دو ہی بڑے اعتراض تھے** اور آج بھی وہی دو ہیں۔ ﴿وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۴۱﴾ وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ ...﴾ [الحاقة: 42, 41:69] ''اور وہ شاعر کی بات نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ کاہن کی بات ہے۔'' آج مہذب عیسائیوں کی نئی سے نئی تصانیف کو اٹھا کر دیکھو تو بڑا زور اس بات پر ہے کہ جیسے عرب میں کاہن تھے اور کہانت کا رواج تھا جس کی جگہ آج سپریچولیزم نے لی ہوئی ہے، ویسے ہی محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ اسی کہانت کے الزام کی تردید ہی ان الفاظ میں ہے ﴿وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾﴾۔ یہ تو دعویٰ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے مضامین ایسے ہیں کہ نہ ہی یہ کاہنوں کے موزوں حال ہے اور نہ ان کی طاقت میں ہے۔ موزوں حال تو اس لیے نہیں کہ **کہانت کو نیکی اور راستبازی سے کوئی تعلق نہیں**۔ بلکہ عموماً ان لوگوں کی زندگیاں ملوث ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں سارا زور نیکی اور راستبازی اور تقویٰ پر دیا گیا ہے اور اسی لیے اس سورت میں بالخصوص جملہ انبیاء کی تعلیم کے اس حصہ پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ تقویٰ اختیار کریں اور کہ نبی ان سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اور یہ دونوں باتیں وہ ہیں جو کاہن میں نہیں پائی جاتیں۔ کاہن اپنے لیے کہانت کو کمائی کا ذریعہ بھی بناتے ہیں اور وہ تقویٰ، نیکی اور راستبازی پر کبھی زور نہیں دیتے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو ان کے پاس کوئی نہ آئے۔ اور تیسری بات جس پر اس سورت میں زور دیا گیا ہے وہ رسول کا امین ہونا ہے۔ یعنی اس کی پہلی زندگی بھی اعلیٰ درجہ کی راستبازی کی ہوتی ہے۔ صرف کاہن نہیں بلکہ شاعر بھی ان باتوں سے خالی ہوتا ہے۔ وہ طالب اجر ہوتا ہے اور کم سے کم واہ واہ کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کی پہلی زندگی ایسی نہیں ہوتی کہ وہ امین کہلا سکے۔ اشعار کا بھی نیکی اور راستبازی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

﴿عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ﴾ میں بتایا کہ ناپاک لوگ تو اس پاک کلام کو سن بھی نہیں سکتے۔ ایک ناپاک قلب پر اس کا نزول کیونکر ہوسکتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتوں کو سن نہیں سکتے نہ استراق کے طور پر نہ کھلے طور پر۔**

2447- عَشِيْرَتَكَ۔ عَشِيْرَة کے لیے [دیکھو نمبر: 630] اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے پکارا: [يَا صَفِيَّةُ بِنْتَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنِّي لَا اَمْلِكُ لَكُمْ

وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

اور اپنے بازو کو اس کے لیے جھکا، جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

سو اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں اس سے بری ہو جو تم کرتے ہو۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾

اور غالب رحم کرنے والے پر بھروسہ رکھ۔ (2448)

الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾

جو تجھے دیکھتا ہے جب تو کھڑا ہوتا ہے۔

مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا] (جامع الترمذی، کتاب الزهد، باب مَا جَاءَ فِي إِنْذَارِ النَّبِيِّ ﷺ قَوْمَهُ، حدیث: 2310) (ج) سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ؐ کی پھوپھی تھیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی صاحبزادی۔ تو آپ نے انہیں اور بنی عبدالمطلب کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو **آنحضرت ﷺ صفا پر چڑھ گئے** اور بلند آواز سے پکارنا شروع کیا اے بنی فہر، اے بنی عدی اور قریش کے مختلف بطنوں کو پکارتے رہے، یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے اور جو شخص خود نہ آ سکا اس نے اپنی طرف سے ایک آدمی بھیج دیا تا کہ وہ دیکھے کہ کیا معاملہ ہے۔ ابولہب بھی آیا اور قریش بھی۔ تو آپ نے فرمایا بتاؤ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ وادی میں ایک لشکر موجود ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تم میری بات کو سچ مان لو گے۔ انہوں نے کہا ہاں! ہمارا ہمیشہ کا تجربہ آپ کے متعلق یہی ہے کہ آپ سچ بولتے ہیں۔ فرمایا تو میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔ تو ابولہب نے کہا تجھ پر ہمیشہ بربادی ہو، کیا اس بات کے لیے تو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا۔ یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے بنی عبد مناف اور عباس اور صفیہ اور فاطمہ کو پکار کر کہا کہ میں اللہ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتا، اور یہ بھی بخاری میں ہے۔

اس انذار میں بھی ایک حکمت تھی۔ کیونکہ انسان کے قریبی سب سے بڑھ کر اس کے حال کو جانتے ہیں۔ اس لیے ان کو ڈرانا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کا آپ کے ساتھ ہو جانا یہاں تک کہ شعب ابی طالب میں کل بنی ہاشم کا آپ کے ساتھ قید کی سختی کو برداشت کرنا بتاتا ہے کہ جو لوگ آپ سے قریب ترین تعلقات رکھتے تھے وہ سب سے بڑھ کر **آپ کی صداقت کے معترف تھے۔**

2448- یہاں انہی دو صفات الٰہی کا اعادہ کیا ہے جو ہر نبی کے ذکر کے آخر میں لائے گئے تھے اور عزیز و رحیم پر توکل میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو غالب بھی کرے گا اور اپنے رحم سے لوگوں کو ایمان کی توفیق بھی دے گا۔ اگر خدا کے کلام پر ایمان ہو تو آج یہی بشارت ہمارے لیے بھی ہے۔

وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾

اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے پھرتے رہنے کو (دیکھتا ہے)۔ (2449)

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾

کیونکہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾

وہ ہر جھوٹ بنانے والے گنہگار پر اُترتے ہیں۔ (2450)

يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

وہ کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ (2451)

2449- ﴿تَقَلُّبَكَ﴾۔ تَقَلُّب کے لیے [دیکھو نمبر: 594] آنحضرت ﷺ کے ﴿تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾﴾ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جب آپ نمازیوں میں امامت کراتے ہیں تو آپ کے مختلف حالات رکوع، سجود وغیرہ کو اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ (ج) اور مراد یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور رکوع اور سجدہ اور قیام میں گڑگڑاتے ہیں وہ انہیں اس حالت میں نہیں چھوڑے گا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ السّٰجِدِيْنَ سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء کے مختلف حالات کو جو انہیں تبلیغ میں پیش آتے تھے دیکھتا تھا۔ اسی طرح آپ کے حالات کو بھی دیکھتا ہے اور آپ کو کامیاب کرے گا۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک معنی مروی ہیں [اَلتَّنَقُّلُ فِيْ أَصْلَابِهِمْ حَتّٰى وَلَدَتْهُ أُمُّهُ] یعنی نیک لوگوں کی پیٹھوں میں آپ کا منتقل ہوتے رہنا یہاں تک کہ آپ کی ماں نے آپ کو جنا۔ یعنی آپ کے آباؤ اجداد ساجدین میں سے تھے اور اس سے **آپ کے والد اور والدہ** کے مومن ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ (ر)

2450- یہاں بتادیا کہ شیاطین کا تعلق تو انسان کی زندگی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کا شیاطین سے تعلق ہو وہ جھوٹ بولتے ہیں اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ بتاتا ہے کہ آپ کا تعلق سرچشمہ قدوسیت ہے تھا۔

2451- **القائے سمع سے مراد:** ﴿يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ﴾ یعنی شیطانوں کی طرف کان لگاتے ہیں اور کان لگانے سے مراد یہ ہے کہ ان کی طرف ان کا سخت میلان ہوتا ہے۔ اس لیے وہ شیاطین سے مختلف باتیں سیکھتے رہتے ہیں۔ (ر) اور ایسے لوگوں کی ظاہری علامت یہ بتائی کہ وہ صادق القول نہیں ہوتے بلکہ عام معاملات میں بھی جھوٹ بولتے رہتے ہیں اور فرشتوں سے شیاطین کا

وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اور (رہے) شاعر، ان کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ ہر وادی میں سرگردان پھرتے ہیں۔ (2452)

باتیں سننا اوپر کی آیت کے صریح خلاف ہے۔

2452- يَّهِيْمُوْنَ۔ هَائِمٌ وہ ہے جو سخت پیاسا ہو اور اس کی جمع هِيْمٌ ہے ﴿فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾﴾ [الواقعة: 55:56] ''پھر پیو گے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔'' اور هُيَامٌ پیاس کی بیماری ہے جو اونٹ کو لگ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی مثال دی جاتی ہے جو سخت عشق میں مبتلا ہو جائے اور ﴿فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾﴾ کے معنی ہیں کہ ہر نوع کے کلام میں پھرتے رہتے ہیں، کبھی مدح میں غلو کرتے ہیں، کبھی مذمت میں۔ اور هَامَ کے معنی ہیں وہ زمین میں نکل گیا، اور اس کا عشق سخت ہوا اور وہ پیاسا ہوا۔ (غ)

شاعر اور نبی میں مابہ الامتیاز:

ان آیات میں اس دوسرے الزام کا جواب دیا ہے کہ یہ شاعر ہے۔ پہلی بات یہ بتائی ہے کہ جو لوگ شاعروں کے متبع ہوتے ہیں وہ حق سے دور پڑے ہوئے ہوتے ہیں ان کو نیکی اور راستبازی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف نبی کے پیروؤں میں نیکی سے محبت حق کی خاطر دکھ اور تکلیفیں اٹھانا، ایسی باتیں ہیں جو شاعر اور نبی میں کھلا کھلا فرق کر دیتی ہیں۔ اور ایک موٹی عقل کا انسان بھی اس بین فرق کو دیکھ سکتا ہے۔ عملاً جو نیکی کی تحریک دنیا میں نبی قائم کرتا ہے وہ ایک ایسا موٹا نشان ہے جو اس کے غیر میں نہیں پایا جاتا۔ کسی محض شاعر نے نیکی کی اس قسم کی تحریک دنیا میں پیدا نہیں کی۔ دوسری بات جو بطور مابہ الامتیاز نبی اور شاعر میں بتائی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر لوگ ہر وادی میں گشت لگاتے رہتے ہیں۔ کسی کی مدح میں اتر آئے تو آسمان و زمین کے قلابے ملا دیئے، کسی کی بدگوئی شروع کی تو دنیا کے سارے عیب اس میں جمع کر دیئے۔ نبی کی تعلیم ان باتوں سے پاک ہوتی ہے۔ اسے کسی کی مدح و ذم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے سامنے ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور اس کی ساری تعلیم اسی مقصد پر زور دینے لیے ہوتی ہے اور اس کی ساری جدوجہد اسی کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ تیسری بات کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ شاعر ﴿يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾﴾ کا مصداق ہوتے ہیں۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خدا کی طرف سے جو لوگ آتے ہیں وہ جو کچھ دوسروں کو کرنے کے لیے کہتے ہیں خود بھی کر کے دکھاتے ہیں۔ وہ نیکی کی تعلیم اگر منہ سے دیتے ہیں تو ان کی اپنی زندگی بھی اس نیکی کا مجسم نمونہ ہوتی ہے۔ ان تین موٹے نشانات کے ہوتے ہوئے ہر ایک شخص نبی اور شاعر میں فرق کر سکتا ہے۔ اول تو وہ ہر قسم کی باتیں کہتے رہتے ہیں۔ شاعر کو صرف نیکی سکھانے سے کوئی تعلق

وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اور کہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ ع 11 36 15

مگر وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اس کے بعد جو ان پر ظلم کیا گیا بدلہ چاہتے ہیں اور جو ظالم ہیں جان لیں گے کہ کس جگہ لوٹ کر جائیں گے۔

نہیں ہوتا۔ پھر اگر وہ کوئی اچھی بات کہتے بھی ہیں تو خود اس پر عمل نہیں کرتے۔

اگلی آیت میں مومنوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ یعنی مومن اگر شعر بھی کہے تو وہ ان باتوں کا مصداق نہیں ہوتا بلکہ کسی امر حق کا اظہار اشعار میں کرتا ہے۔ ﴿وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا﴾ میں اشارہ یہ ہے کہ جب انہیں بہت برا کہا جاتا ہے تو وہ کبھی مدافعت کے طور پر ظالم کے عیوب کا ذکر اشعار میں کر دیتے ہیں۔ اور یہ ضرورت مسلمانوں کو مدینہ میں پیش آئی۔ حالانکہ یہ سورت مکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا منع نہیں اور **مومن بھی شاعر ہو سکتا ہے**، مگر اس کی شاعری عام شاعر کی بیہودگیوں سے پاک ہونی چاہیے۔

سورۃ النمل

نام:

اس سورت کا نام اَلنَّمۡل ہے اور اس میں 7 رکوع اور 93 آیات ہیں اور اس کا نام نمل اس واقعہ سے لیا گیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق اس میں بیان ہوا ہے۔ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس قدر قوت اور رعب کا دیا جانا کہ قومیں ان کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کے سامنے سر جھکانے لگیں اور اس سورت کے اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ ایسی ہی شوکت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملے گی۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ یہ قرآن منجانب اللہ وحی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کا ذکر کر کے اور اس کے مخالفوں کا انجام بتا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کی مخالفت بھی سرسبز نہ ہوگی۔

③،② دوسرے اور تیسرے رکوع میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے جن میں بنی اسرائیل کا سلسلہ اپنی دنیوی شوکت کے کمال کو پہنچا۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ شوکت جو بنی اسرائیل کو اس قدر مدت کے بعد ملی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دی جائے گی۔

④ چوتھے رکوع میں حضرت صالح اور لوط علیہم السلام کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو سمجھایا ہے کہ ان پیغمبروں کے مخالفین کی تباہ شدہ بستیوں کو تم بارہا شام کو جاتے ہوئے دیکھ چکے ہو، اس سے سبق لو۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے برگزیدہ کیا ہے وہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ سے سلامت رہیں گے اور ملک میں بادشاہ بنائے جائیں گے۔

⑥ چھٹے رکوع میں مخالفین کے انکار اور ان کی سزا کا ذکر ہے اور

⑦ ساتویں میں بتایا ہے کہ بڑے بڑے مخالفین کو سزا دے کر ان کی شرارت کو روک دیا جائے گا اور بالآخر لوگ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

تعلق:

چونکہ ان تینوں سورتوں کے یہاں رکھے جانے پر پچھلی سورت کے شروع میں بحث گزر چکی ہے، اس لیے یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس قدر بڑھا دینا ضروری ہے کہ سورۃ الشعراء میں فرعون کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ پر زور دیا تھا اور اس کی آخری ہلاکت کا ذکر کیا تھا اور وہاں اشارۃً یہ کہا تھا کہ سلطنت و شوکت کی وہ نعمتیں جن سے فرعون کو محروم کیا گیا وہ ہم نے آخر کار

اٰیَاتُهَا 93 (27) سُوۡرَۃُ النَّمۡلِ مَكِّيَّةٌ (48) رُكُوۡعَاتُهَا 7

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

طٰسٓ‌ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيۡنٍ ۙ﴿۱﴾

طور سینا (کی وحی پر غور کرو) یہ قرآن اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

هُدًى وَّ بُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ﴿۲﴾

مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳﴾

جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فَهُمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ؕ﴿۴﴾

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ہم نے ان کے عملوں کو ان کے لیے اچھا کر کے دکھایا ہے مگر وہ حیران پھر رہے ہیں۔ (2453)

بنی اسرائیل کو دیں ﴿وَ اَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ [الشعرآء: 59:26] ''اور ان (چیزوں کا) وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔'' اور اب اس سورت میں ان نعمتوں کا مفصل ذکر کیا اور بتایا کہ وہ اپنے کمال کو حضرت سلیمان علیہ السلام میں جا کر پہنچیں۔ کیونکہ انبیائے بنی اسرائیل ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے تھے۔ اس لیے شوکت بھی سلسلہ اسرائیلی کو فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں ملی بلکہ اس کا کمال حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں ہوا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے متعلق اسی سورت میں فرمایا کہ ہم آپ کے صحابہ کو بھی بادشاہت عطا فرمائیں گے۔ پس مضمون کا تقاضا تھا کہ سورۃ النمل کو سورۃ الشعراء کے بعد رکھا جاتا۔

زمانۂ نزول:

زمانۂ نزول پر بھی پچھلی سورت میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سورت کی [آیت: 72] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول قریب زمانہ ہجرت میں ہوا۔

2453- دوسری جگہ صراحت ہے ﴿وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴾ [الأنعام: 43:6] یعنی جو برے کام تم کرتے تھے وہ شیطان انہیں اچھے کر کے دکھاتا تھا۔ ایک ہی کام اللہ تعالیٰ اور شیطان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ پس یہاں جن اعمال کے

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَ هُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝۵	یہی ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور وہ آخرت میں سب سے بڑھ کر نقصان اٹھانے والے ہیں۔
وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝۶	اور یقیناً تجھے قرآن حکمت والے علم والے کی طرف سے دیا جاتا ہے۔
اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷	جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا، میں نے آگ دیکھی ہے، میں اس سے تمہارے لیے خبر لاؤں گا یا تمہارے پاس جلتا ہوا شعلہ لاؤں گا تاکہ تم سینکو۔(2454)
فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸	سو جب اس کے پاس آیا آواز آئی کہ برکت دیا گیا جو آگ میں ہے اور جو اس کے ارد گرد ہے اور اللہ جہانوں کا رب (سب نقصوں سے) پاک ہے۔(2455)

الثلثة

اچھا کر کے دکھانے کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے وہ اعمال بد نہیں ہو سکتے جو وہ کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اعمال حسنہ ہیں جو انہیں کرنے چاہئیں۔ اور حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے یہاں اعمال سے مراد اعمال حسنہ ہی لیے ہیں۔ (ر) اور وہ بھی ان کے اعمال کہلا سکتے ہیں اس لیے کہ انہیں کرنے کو کہا گیا۔

2454- ﴿تَصْطَلُوْنَ﴾۔ اِصْطِلَاءٌ کا مادہ صَلّٰی ہے اور [صَلّٰی يَدَهٗ بِالنَّارِ] کے معنی ہیں اسے گرم کیا۔ اور اِصْطَلٰی کے بھی یہی معنی ہیں۔ (غ) آگ کے دیکھنے پر [نمبر: 2048] میں بحث گزر چکی ہے۔

2455- ابن جریر میں ﴿مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ میں دو قول لکھے ہیں۔ اول یہ کہ ﴿مَنْ فِي النَّارِ﴾ سے مراد خود اللہ تعالیٰ ہے اور یہ نار گویا اسی کا نور تھی اور ﴿مَنْ حَوْلَهَا﴾ سے مراد ملائکہ ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ﴿مَنْ فِي النَّارِ﴾ سے مراد خود نار ہے یعنی یہ آگ بابرکت ہے اور ﴿مَنْ حَوْلَهَا﴾ سے مراد موسیٰ اور فرشتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اس آگ کے اندر تھا؟ اس کا جواب تو خود یہیں موجود ہے ﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو۔ پس ﴿مَنْ فِي النَّارِ﴾ سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کا نور ہے یعنی یہ آگ آگ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نور اس میں ہے۔ گویا یہ حقیقی طور پر آگ نہ تھی بلکہ کشف کے رنگ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دکھائی گئی تھی اور یا ﴿مَنْ فِي النَّارِ﴾ سے مراد موضع نار ہے یعنی جہاں آگ ہے وہ بابرکت مقام ہے اور اس کا

یٰمُوۡسٰۤی اِنَّہٗۤ اَنَا اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۙ﴿۹﴾

اے موسیٰ میں اللہ غالب حکمت والا ہوں۔

وَ اَلۡقِ عَصَاکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہَا تَہۡتَزُّ کَاَنَّہَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدۡبِرًا وَّ لَمۡ یُعَقِّبۡ ؕ یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ ۫ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ۖ﴿۱۰﴾

اور اپنا عصا ڈال دے، سو جب اسے ہلتا ہوا دیکھا گویا وہ چھوٹا سانپ ہے، پیٹھ پھیر کر الٹا بھاگا اور مڑ کر نہ دیکھا، اے موسیٰ! ڈر نہیں میرے ہاں رسولوں کو کوئی خوف نہیں۔

اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱﴾

مگر جو ظلم کرتا ہے پھر بدی کے بعد بدل کر نیکی کرتا ہے تو میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔(2456)

وَ اَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ؕ فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ قَوۡمِہٖ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ﴿۱۲﴾

اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، بغیر کسی روگ کے سفید نکلے گا۔ فرعون اور اس کی قوم کی طرف نو نشانوں میں سے ہے، وہ نافرمان لوگ ہیں۔

اردگرد بھی۔ اور اس کی تائید میں اُبی کی قراءت [تَبَارَكَتِ الْاَرْضَ وَمَنْ حَوْلَهَا]۔ یعنی یہ مقام اور اس کا اردگرد بابرکت ہے۔ بلکہ خود قرآن کریم نے دوسری جگہ اسے ﴿الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ﴾ [القصص: 30:28] ''بابرکت جگہ میں'' کہہ کر بھی واضح کر دیا ہے اور اس صورت میں اس زمین کو بابرکت اس لحاظ سے کہا کہ وہاں بہت سے انبیاء ہونے والے تھے۔

2456- اِلَّا استثنائے منقطع ہے۔ (ر) اوپر فرمایا تھا کہ رسولوں کو خوف نہیں اور یہاں ﴿اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ﴾ میں فرمایا کہ خوف تو ظالموں کو ہوسکتا ہے (اور رسول جب ظالم نہیں تو انہیں خوف کیسا) اور ظلم کرنے والے کو بھی خوف اسی صورت میں ہے جب وہ اس ظلم سے باز نہ آئے۔ لیکن جو شخص ظلم کر کے پھر نیکی کرتا ہے اسے بھی کوئی خوف نہیں، اور مغنی میں ہے کہ اِلَّا بعض وقت عاطفہ ہوتا ہے یعنی واؤ کی جگہ اور لکھا ہے کہ اخفش اور فراء اور ابوعبیدہ نے اس کا ذکر کیا ہے اور یہ معنی اس لیے یہاں لیے گئے ہیں اور ﴿لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ [البقرۃ: 150:3] ''تاکہ لوگوں کے لیے کوئی دلیل تمہارے خلاف نہ رہے، مگر وہ جو ان میں سے ظالم ہیں۔'' میں اس صورت میں عاطفہ قرار دے کر یَخَافُ کے نیچے آئے گا یعنی مرسلوں کو خوف نہیں اور نہ ان لوگوں کو جو ظلم کر کے پھر نیکی کا طریق اختیار کریں۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

سو جب ان کے پاس ہماری بصیرت دینے والی نشانیاں آئیں انہوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع 1 14 16

اور ظلم اور تکبر سے ان کا انکار کیا۔ حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔ پس دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور انہوں نے کہا سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے۔

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا۔ اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے (2457) اور ہمیں ہر ایک چیز دی گئی ہے۔ یہ صریح فضل ہے۔

2457- ﴿مَنْطِقَ﴾۔ نُطق تعارف میں الگ الگ آوازیں ہیں جو زبان سے نکلتی ہیں اور انہیں کان محفوظ رکھتے ہیں۔ ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ﴾ [الصافات: 92:37] ''تمہیں کیا ہوا تم بولتے نہیں۔'' اور نطق صرف انسان کے لیے کہا جاتا ہے اور دوسرے کے لیے بطور مجاز بولا جا سکتا ہے، اور منطقیوں کے نزدیک نطق قوت گویائی کو بھی کہتے ہیں اور ناطِق اسے بھی کہا جاتا ہے جو کسی چیز پر دلالت کرے اور ﴿مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ [الأنبیآء: 65:21] ''کہ یہ بات نہیں کرتے۔'' میں اشارہ ہے کہ وہ ناطق ذوی العقول کی جنس سے نہیں اور ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [حٰمٓ السجدة: 21:41] ''اللہ نے ہمیں بولنے کی قوت دی، جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت دی۔'' میں مراد اعتبار یعنی دلالت ہی ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک شے کا گویا ہونا بلحاظ دلالت ہی ہے اور ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ میں پرندوں کی آوازوں کو نطق سلیمان کے لحاظ سے کہا ہے کیونکہ وہ انہیں سمجھتے تھے۔ پس جو کوئی کسی چیز سے کچھ سمجھ لیتا ہے وہ اس کے لحاظ سے ناطق ہو جاتی ہیں گو وہ صامت ہو۔ اور جو نہیں سمجھتا اس کے لحاظ سے وہ صامت ہوتی ہے گو وہ ناطق ہو اور ﴿هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ [الجاثية: 29:45] ''یہ ہماری کتاب تمہارے

بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے۔'' میں کہا گیا ہے کہ کتاب ناطق ہوگی لیکن اس کے نطق کو آنکھ پائے گی (یعنی انسان کا اس کو پڑھنا گویا کتاب کا نطق ہے)۔(غ) اور [کِتَابٌ نَاطِقٌ] سے مراد واضح کتاب ہے، گویا کہ وہ کلام کرتی ہے۔(ل)

سلیمانؑ کے وارث داؤد ہونے سے مراد بادشاہت اور نبوت میں وارث ہونا ہے اور مال کی وراثت مراد نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سلیمان علیہ السلام کو حضرت داؤد علیہ السلام کی ساری اولاد میں سے مخصوص نہ کیا جاتا۔ اور انبیاء کا مال بطور ورثہ نہیں لیا جاتا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [-نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَآءِ- لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ] (صحیح البخاری، کتاب فَرْضِ الْخُمُسِ، باب فَرْضِ الْخُمُسِ، حدیث: 3093) ہم انبیاء کے گروہ سے ورثہ نہیں لیا جاتا، جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔(ث) اور یہ ظاہر ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ سے مراد:

یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کہتے ہیں ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ یعنی ہمیں پرندوں کی منطق یا بولی سکھائی گئی ہے۔ مفسرین نے اس پر زیادتی کر کے بعض تمام حیوانات کو اور بعض نے درختوں اور نباتات کو بھی شامل کیا ہے۔ گویا حضرت سلیمان علیہ السلام تمام جانوروں کی اور درختوں اور نباتات کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ جس کے لیے نہ قرآن شریف میں کوئی سند ہے نہ حدیث صحیح میں۔ رہا یہ کہ منطق طیر سکھائے جانے سے کیا مراد ہے؟ سو پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ یہاں حضرت سلیمانؑ عُلِّمْنَا کہتے ہیں عُلِّمْتُ نہیں کہتے۔ یعنی صرف اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ پس عُلِّمْنَا سے یا تو مراد یہ ہے کہ ساری قوم کو منطق طیر سکھایا گیا اور یا کم سے کم یہ قول بادشاہت کی حیثیت میں کہا ہے یعنی گو کہنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں مگر اس میں قوم شامل ہے۔ جس طرح ﴿أُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ سے مراد کل قوم ہے۔ پس جس طرح بادشاہت کے سامانوں کے دیئے جانے سے کل قوم کا فائدہ اٹھانا ہے اسی طرح ﴿مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ کے سکھایا جانے سے بھی مراد کل قوم کو سکھانا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ پرندوں کی منطق سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ پرند بھی انسانوں کی طرح سب علوم سے واقف ہیں اور صرف ان کی بولی مختلف ہے۔ جس طرح مثلاً ایک انگریز ایک ہندوستانی کی بولی کو سمجھ سکتا ہے اور ایک ہندوستانی ایک انگریز کی بولی کو، اسی طرح کی بولی پرندوں کی نہیں۔ بلاشبہ جب ایک مرغی اپنے بچوں کو دانہ دینے کے لیے بلاتی ہے اس کی اور آواز ہوتی ہے اور جب کسی چیز کا خوف ہوتا ہے تو اس کی اور آواز ہوتی ہے۔ مگر یہ اختلاف آواز جو پرندوں میں پایا جاتا ہے صرف دو چار باتوں تک محدود ہوتا ہے، اور ان آوازوں میں ہر ایک وہ شخص فرق کرسکتا ہے جسے ان پرندوں کو بار بار دیکھنے کا موقعہ ملا ہو۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مرغی بعض وقت اپنے بچوں کو لیکچر دیتی ہو کہ تم اپنی صحت کے تحفظ کے لیے فلاں قسم کی غذا کھاؤ، فلاں نہ کھاؤ، فلاں قسم کے جانور سے اپنے آپ کو بچاؤ، فلاں سے نہ بچاؤ۔ اور نہ ہی اس خیال کے نیچے کوئی حقیقت ہے کہ جانوروں کو غیب کا علم ہوتا ہے اور انسان کو تو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا مگر ایک گدھے کو علم ہوتا ہے۔ اس لیے ایک انسان جب گدھے کی بولی سمجھنے لگ جائے تو اس کو پتہ لگ جاتا ہے کہ کل اس کو یہ مصیبت پیش آنے والی ہے اور فلاں بات سے اس کو نفع حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ ﴿مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ کے علم سے اکثر لوگوں کے خیال میں اسی قسم کی باتیں ہیں۔ علم غیب تو اللہ

وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ اور سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں اور انسانوں اور

تعالیٰ ہر انسان کو بھی نہیں دیتا جسے اس نے خلیفہ بنایا، جسے کل مخلوق پر حکمران کیا۔ ﴿فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ [الجن: 26:72, 27] ''سو وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب نہیں کرتا۔ ہاں جسے رسول بنانا پسند کرے۔'' پرندوں اور حیوانات کو علم غیب کا ملنا خلاف عقل ہی نہیں بلکہ سارے اصول دین کو باطل کرتا ہے اور خلاف نص قرآنی ہے۔ اور تفسیروں میں جو ایسے اقوال ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک فاختہ پر گزرے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کہہ رہی ہے کہ [لَیْتَ ذَا الْخَلَقَ لَمْ یَخْلُقُوْا] کاش یہ مخلوق پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ اور طاؤس بولا تو کہا یہ کہہ رہا ہے [کَمَا تُدِیْنُ تُدَانَ] جس طرح تو معاملہ کرے گا اسی طرح تجھ سے کیا جائے گا۔ اور ہدہد کہہ رہی تھی [اَسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ تَعَالٰی] اللہ تعالیٰ سے حفاظت چاہو اور کوئی جانور کہہ رہا تھا [مَنْ سَکَتَ سَلِمَ] وغیرہ تو یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ یوں تو جانوروں کی بولیوں سے لوگوں نے سارا قرآن بھی بنالیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ باتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بتائیں، حالانکہ علم بھی دیا، فہم بھی دیا، نبوت بھی دی اور جانوروں سے ان حقائق کا پتہ لگا۔ یہ کیسی کچی بات ہے۔ ہاں یہ جانور خدا کی تسبیح کرتے ہیں ﴿وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ [بنی إسرائیل: 44:17] ''لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔'' ارشاد خداوندی ہے انسان ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتا۔ ہر چیز اپنے رنگ میں تسبیح کرتی ہے اور قرآن کریم کے بیان سے ظاہر ہے کہ ﴿مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ کوئی سلطنت کے سامانوں میں سے ہے جس کو ﴿اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ﴾ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے فرمایا کہ ہمیں ﴿مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ دیا گیا ہے جو سلطنت کے سامانوں میں سے ایک ہے، پھر فرمایا سبھی قسم کے سامان دیئے گئے ہیں۔ یہی مراد ﴿اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ﴾ سے ہے جیسا کہ آگے ملکہ سبا کے بیان میں ﴿اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ﴾ [23] ہے۔ بہرحال یہ کوئی عظیم الشان نعمت ہے جس کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ﴾ سے بھی ظاہر ہے۔ اور اگلی آیت میں پرندوں کو فوجوں کا حصہ قرار دے کر یہ صاف بھی کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ کبھی چڑیا کی چوں چوں سننے بیٹھ جاتے تھے اور کبھی کوے کی کائیں کائیں کو۔ لفظ منطق کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کسی چیز کی حالت سے فہم کا حاصل ہونا بھی ہے جیسے کتاب ناطق سے مراد بولنے والی کتاب نہیں بلکہ بین کتاب ہے جس کے پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ اصل معنی کے لحاظ سے منطق کا لفظ صرف انسان پر بولا جا سکتا ہے اور چونکہ یہاں ﴿مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ کا تعلق سلطنت کے سامانوں سے اور سلطنت کے سامانوں میں بالخصوص قدیم زمانہ میں سب سے بڑا کام جو پرندوں سے لیا جاتا تھا وہ نامہ بری کا کام تھا۔ تو مجازاً وہ نامہ جو پرند ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے ﴿مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ ہی کہلائے گا۔ اگر نامہ بری مراد نہ ہوتی تو طیر کے نطق کا بالخصوص کیوں ذکر ہوتا، دوسرے جانوروں کا ذکر کیوں نہ ہوتا۔ پس سیاق اور لغت دونوں اسی معنی کو چاہتے ہیں۔ فی الواقع پرندوں کے آوازوں کے نیچے کوئی ایسا مفہوم نہیں ہوتا جس طرح انسان ایک بولی بولتا ہے۔ اور بعض خاص قواعد کے لحاظ سے جس کو زبان کی صرف ونحو کہا جاتا ہے اور الفاظ کے خاص مفہوم کے لحاظ سے جسے لغت کہا جاتا ہے وہ آوازیں نکالتے ہیں۔

الۡاِنۡسِ وَ الطَّیۡرِ فَهُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾ پرندوں سے اکھٹے کئے گئے اور انہیں روکا جاتا تھا۔ (2458)

2458- ﴿یُوۡزَعُوۡنَ﴾۔ وَزْع نفس کو ہوا وحرص سے روکنا ہے، پھر مطلق روکنا۔ اور لشکر میں وَازِعْ وہ شخص ہوتا ہے جو صفوں میں سے آگے پیچھے ہونے والے کو روکے۔ اور یہاں یُوْزَعُوْنَ کے معنی ہیں کہ ان کے پہلے ان کے پچھلوں پر روکے جاتے ہیں اور یا یہ کہ انہیں باز رکھا جاتا ہے۔ اور حدیث حسن میں وَزْعَۃٌ کے معنی ہیں وہ لوگ جو دوسروں کو تعدی اور فساد اور شر سے روکیں اور اُوْزِعَ کے معنی ہیں اُلْهِمَ اور ﴿رَبِّ اَوْزِعْنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ﴾ [19] میں اَلْهَمَنِیْ مراد ہے یعنی مجھے ایسا الہام کر۔ (ل) [وَزَعْتُهُ عَنْ کَذَا] میں نے اسے اس چیز سے روک دیا اور یہاں یُوْزَعُوْنَ میں اشارہ ہے کہ وہ باوجود اپنی کثرت اور تفاوت کے بے ترتیب ایک دوسرے سے الگ پڑے ہوئے نہ تھے بلکہ حکم اور ضبط کے ماتحت تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد اس سے پہلوں کا پچھلوں کی خاطر روک دینا ہے اور ﴿یَوۡمَ یُحۡشَرُ اَعۡدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ [حٰمٓ السجدۃ: 19:41] ''جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف چلائے جائیں گے تو وہ جدا جدا جماعتوں میں تقسیم کیے جائیں گے۔'' میں عقوبت کے طور پر روکنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ﴿وَ لَهُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِیۡدٍ ﴿۲۱﴾﴾ [الحج: 21:22] ''اور ان کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔'' اور [اَوْزِعَ اللّٰهُ فُلَانًا] کے معنی ہیں اسے الہام کیا۔ اور ﴿اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ﴾ میں اصل مراد یہ ہے کہ مجھے ایسا بنا کہ اپنے نفس کو کفران سے روکوں۔ (غ)

حضرت سلیمانؑ کا افواج کو زیادتی سے روکنا:

یہاں لشکروں کا جمع ہونا صاف بتاتا ہے کہ کسی بھاری جنگ کی تیاری ہے اور ﴿فَهُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منزل بمنزل چلتے تھے۔ چنانچہ ابن جریر میں ایک قول ہے یُسَأَقُوْنَ اور منزل بمنزل چلنے میں روکنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور غالباً [یَرُدُّ أَوَّلُهُمْ عَلٰی اٰخِرِهِمْ] کے یہی معنی ہیں جو اکثر مفسرین نے قبول کیے ہیں۔ لیکن اگلی آیت کے مضمون کے لحاظ سے اور لفظ وزع کے اصل معنی کے لحاظ سے یہ معنی بہتر معلوم ہوتے ہیں کہ ان لشکروں کو فساد یا ناحق لوگوں کا مال لینے سے روکا جاتا تھا اور یہی مراد امام راغب کی ان کے ضبط کے نیچے ہونے سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ان میں ایسا ضبط تھا کہ وہ لوگوں پر لوٹ مار کرتے نہ جاتے تھے۔ گویا بتایا ہے کہ جنگ کے وقت افواج کو عام لوگوں پر زیادتی سے روکنا چاہیے۔

حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں پرندوں کا کام:

سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو تین قسم کہا گیا ہے۔ جن، انس، طیر۔ طیر سے مراد تو وہی معلوم ہوتا ہے جو پچھلے نوٹ میں ذکر ہوا یعنی پرندے سے جو نامہ بری کا کام دیتے تھے ایک بڑے لشکر کی یہ ایسی ہی سخت ضرورت تھی۔ جیسے آج بے تار خبر رسانی کی۔ ورنہ یہ ایک بے معنی بات ہے کہ ساری دنیا کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجوں میں شامل ہوں۔ اور کوے اور چڑیا اور فاختہ اور طوطے سب دنیا سے اکٹھے ہو کر وہاں پہنچ گئے ہوں۔ اس دقت کی وجہ سے مفسرین نے یوں کہا ہے کہ ہر قسم کا ایک

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۸

یہاں تک کہ جب وادیٔ نمل میں آئے ایک نملہ نے کہا اے نملو! اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ۔ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل نہ ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ (2459)

ایک پرندہ آ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی لشکر کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے انہیں لشکر کا ضروری حصہ قرار دے کر صاف بتا دیا ہے کہ مراد اس سے صرف نامہ بر پرند ہو سکتے ہیں۔ مفسرین نے پرندوں کی دو غرضیں بتائیں ہیں۔ ایک یہی نامہ بری، دوسرے سورج سے سایہ کرنا۔ (ر) یعنی جب دربار لگتا تھا تو ہر ایک قسم کے پرند اوپر آ کر سایہ کرتے تھے۔ یہ دوسری بے معنی بات ہے۔ پرندوں کا سایہ کیا ہوگا کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ اور بارش آتی تھی تو پھر کیا کرتے تھے اور ان کے پاس خیمے نہ تھے۔ وہ تو فرماتے ہیں: ﴿اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ﴾۔

جنوں کے لشکر کا کام:

دوسرا سوال یہ ہے کہ جنوں کے لشکر سے کیا مراد ہے؟ اس کو بھی قرآن کریم نے خود صاف کر دیا ہے ... ﴿یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ﴾ [سبأ: 13:34] ''وہ اس کے لیے جو وہ چاہتا تھا بناتے تھے (یعنی) مسجدیں اور مجسمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور ایک جگہ دھری رہنے والی دیگیں۔'' گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کے بڑے بڑے صناعی کے کام یہ لوگ کرتے تھے۔ اور چونکہ غیر اسرائیل اور پہاڑی اقوام کے لوگ تھے اس لیے انہیں جن کہا ہے اور لشکر میں ایسے کاریگروں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

2459- ﴿وَادِ النَّمْلِ﴾۔ [وَادِی النَّمْلِ بَیْنَ جِبْرِیْنَ وَ عَسْقَلَانِ]۔ (ت) وادی النمل جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے۔ اور قتادہ اور مقاتل سے مروی ہے کہ وہ ارض شام میں ہے۔ کعب کا قول ہے کہ وہ طائف میں ہے اور بعض کا قول ہے کہ وہ نواح یمن میں ہے اور وہ عرب کے نزدیک ایک مشہور جگہ ہے جس کا ذکر ان کے اشعار میں آتا ہے۔ (د) اس سے معلوم ہوا کہ وادی النمل کے معنی چیونٹیوں کی وادی نہیں، نہ چیونٹیاں کسی خاص وادی میں رہا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے اور میرے نزدیک ترجیح اسی قول کو ہے کہ وہ نواح یمن میں ہے۔ کیونکہ بظاہر ملکہ سبا پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ چڑھائی تھی۔

﴿نَمْلَةٌ﴾۔ نمل چیونٹیوں کو کہتے ہیں۔ جس کا واحد نَمْلَةٌ ہے، مگر یہ کسی قوم کا نام بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ نہ صرف وادی النمل سے ظاہر ہے جو کسی قوم کے نام پر ہی ہوسکتی ہے بلکہ قاموس میں ہے [اَلْاَبْرَقَةُ مِنْ مِیَاهِ نَمْلَةُ] یعنی ابرقہ نملہ کے پانیوں سے ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نملہ قوم کا نام ہے جس کے پانیوں کا یہاں ذکر ہے اور عربی میں اسی طرح پر قوموں کے نام آتے ہیں۔ مثلاً مَازِن چیونٹی کے انڈوں کو بھی کہتے ہیں اور ایک قوم کا نام بھی ہے۔ اور ابن عساکر نے حسن سے روایت کی ہے

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنۡ قَوۡلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ

تو اس کی بات پر خوش ہوتا ہوا مسکرایا اور کہا، اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ تیری نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھے پر اور میرے ماں باپ پر انعام کیا اور کہ میں

کہ اس نَمْلَة کا نام حرس تھا اور وہ قبیلہ [بَنِي الْشَيْصَانْ] سے تھی۔ (ث) اور نام اور قبیلے انسانوں کے ہوا کرتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اور چیونٹی:

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے ہوسکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا گزر چیونٹیوں پر ہی ہوا ہو۔ اور چیونٹی کا کہنا کہ اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ زبان سے نہیں بلکہ حالت سے ہوگا۔ کیونکہ قول کا لفظ اس طرح آ جاتا ہے [دیکھو نمبر: 45]۔ اور چیونٹیوں کو لغت عربی سے واقفیت نہیں نہ وہ زبان کے قواعد سے واقف ہیں کہ اس طرح پر کلام کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کا فعل تھا کہ وہ انسانوں کی آہٹ پا کر اپنے سوراخوں میں گھس گئیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ ایک جنگل میں رہنے والی چیونٹیاں جنہوں نے سلیمان کو کبھی دیکھا نہیں انہیں یہ علم ہو گیا ہو کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ انسان کو تو بغیر بتانے کے پتہ نہیں لگ سکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کون ہیں اور چیونٹی نے جھٹ پہچان لیا۔ اور پھر ایک چیونٹی کو جس کی نظر چند گز سے آگے نہیں جاسکتی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بے شمار لشکر بھی نظر آ گئے۔ یا یہ کہنا پڑے گا کہ اس خاص چیونٹی کو اللہ تعالیٰ نے وحی کر دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی اس رنگ میں بشر سے مخصوص ہے۔ اور دوسرے جانداروں کو جو وحی ہوتی ہے وہ اور رنگ کی ہوتی ہے۔ جیسے ﴿وَ اَوۡحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحۡلِ﴾ [النحل: 68:16] ''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی'' میں۔ اور ایک قول ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کوئی آواز نہیں سنی بلکہ اللہ تعالیٰ نے الہاماً آپ کو اطلاع دی ہے اور ایک قول ہے کہ چیونٹی کا اپنے سوراخوں کا رخ کرنا ہی گویا اپنی حالت سے یہ کہنا تھا۔ (ر) اور یہ خیال بھی کہ یہ ﴿مَنۡطِقَ الطَّیۡرِ﴾ کے علم کی مثال ہے، صحیح نہیں۔ اس لیے کہ چیونٹی کو طیر نہیں کہا جاتا۔ گو بعض چیونٹیوں کے پر بھی نکل آتے ہوں۔ پھر یہ کوئی مفید کلام نہیں جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو کچھ علم حاصل ہوا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ دقت ہے کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام کے اتنے بے شمار لشکر، اتنے لمبے سفر میں بغیر کسی چیونٹی کو پاؤں کے نیچے مسلنے کے چلے جا رہے تھے۔ یہ ناممکن محض ہے۔ پھر ایک چیونٹی کا کلام سنا اور جو کروڑوں رستہ میں مر گئی ہوں گی وہ کیوں نہ بولیں۔ ان مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے معنی زیادہ قرین قیاس ہیں کہ یہ کوئی قوم تھی جن کو علم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی افواج کے ساتھ آ رہے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم خواہ مخواہ مخالف سمجھ کر ماریں جائیں۔ اور **گھروں میں داخل ہو جانا** اس بات کا نشان ہے کہ ان کا ارادہ مقابلہ کا نہیں بلکہ فرمانبرداری کا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس بات کو سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام خوش بھی ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا بھی شکر کیا کہ لوگ آپ کی فرمانبرداری اختیار کر رہے ہیں۔ ورنہ چند چیونٹیوں کا اپنے سوراخوں میں گھس جانا کون سا شکر نعمت کا موقع تھا۔ جب ہزاروں چیونٹیاں اور لاکھوں کیڑے مکوڑے روزانہ اتنے بڑے لشکر کے پاؤں کے نیچے مسلے جاتے ہوں گے۔ ﴿هُمۡ لَا

صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

اچھے عمل کروں جن سے تو راضی ہو اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں داخل فرما۔(2460)

وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور پرندوں کو طلب کیا تو کہا، کیا بات ہے میں ہُد ہُد کو نہیں دیکھتا، کیا وہ غیر حاضر ہے۔(2461)

يَشْعُرُوْنَ﴾ یعنی وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ یہ قوم ہماری دشمن نہیں۔ کیونکہ یہ وادی نواح یمن میں تھی اور ملکہ سبا پر چڑھائی تھی۔ پس یہ قرین قیاس تھا کہ اردگرد کی قوموں کو بھی دشمن سمجھا جاتا۔ چنانچہ کعب احبار سے روایت ہے کہ **حضرت سلیمانؑ یمن کے ارادہ** سے بیت المقدس سے روانہ ہوئے اور مدینہ اور مکہ پر سے گزرے اور چلتے گئے۔ یہاں تک کہ آپ وادی النمل پہنچے۔ (ر) اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ جس طرح **حضرت سلیمان علیہ السلام کے رعب** کے سامنے قومیں سر جھکاتی تھیں اسی طرح **نبی کریم ﷺ کو بھی رعب دیا جائے گا۔** بلکہ آپؐ کا رعب اس سے بدرجہا زیادہ ثابت ہوا۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے [نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ] (صحيح البخاری، کتاب التيمم، باب، حديث: 335) میری مدد ایسے رعب سے کی گئی ہے جو ایک مہینہ کی مسافت پر اثر کرتا ہے۔ اور سلسلہ موسوی میں اس قدر زمانہ اس رعب اور حکومت کے ملنے میں لگا، کیونکہ وہ سب انبیاء ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرنے والے تھے۔ مگر اسلام کی تاریخ میں وہ شوکت و رعب نبی کریم ﷺ سے ہی شروع ہوا۔ اس لیے یہاں آپ کے بعد اور کوئی نبی نہ آنے والا تھا جو آپ کے کام کی تکمیل کرتا۔ جس طرح تکمیل دین آپ کے ساتھ کر دی گئی، اسی طرح اتمام نعمت بھی آپ کے ساتھ ہی کر دیا گیا، اور کوئی حالت منتظرہ اس کے لیے باقی نہ چھوڑی گئی۔

2460- فَتَبَسَّمَ۔ بَسَمَ اور تَبَسَّمَ کے معنی ہیں مسکرایا۔ (ل) اور ضَاحِكٌ سے مراد یہاں خوش ہونے والا ہے۔ (غ) [دیکھو نمبر: 1482]

نمل کی اطاعت پر شکر گزاری:

﴿قَوْلِهَا﴾ ضمیر بلحاظ لفظ نَمْلَةٌ ہے یا مراد وہ قوم ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ خبر پہنچی تو وہ خوش ہوئے اور اس نعمت پر شکر الٰہی کیا کہ ان کے ہاتھ سے بے فائدہ خونریزی نہیں ہوئی۔ اور محض ان کی افواج اور سامان کو دیکھ کر قومیں اطاعت اختیار کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی لیے عمل صالح کی توفیق بھی مانگی کہ ایسا نہ ہو کہ توسیع حکومت کے خیال میں کوئی عمل خلاف رضائے الٰہی ہو جائے۔ اس میں یہ بھی دکھایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا اصل مقصد باوجود حکومت کے خرخشوں اور فوج کشی کی ضروریات کے رضائے الٰہی کا حصول ہی رہتا ہے نہ کچھ اور۔ ان میں ملک گیری کی ہوس کوئی نہیں ہوتی اور اصل غرض تو یہ بتانا ہے کہ ایسے ہی واقعات محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی پیش آنے والے ہیں۔ اور سوائے سخت ضرورت کے آپ کے ہاتھ سے خونریزی نہ ہوگی۔

2461- ﴿تَفَقَّدَ﴾۔ فَقْد وجود کے بعد کسی چیز کا عدم ہے یعنی کسی چیز کا گم ہو جانا۔ پس وہ عدم سے خاص تر ہے۔ ﴿مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ﴾

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ [یوسف: 72, 71:12] ''تم کیا نہیں پاتے؟ انہوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیالہ نہیں پاتے۔'' اور تَفَقَّدَ کے معنی تَعَهُّد ہیں۔ لیکن اس کی اصل حقیقت کسی چیز کے گم ہو جانے کو پہچاننا ہے۔ (غ) اور تَفَقَّدَ اس چیز کا طلب کرنا ہے جو غائب ہو۔ (ل)

حضرت سلیمانؑ اور ہدہد:

مفسرین کہتے ہیں کہ پرند حضرت سلیمان علیہ السلام پر سایہ کرتے تھے۔ تو کیا حضرت سلیمان علیہ السلام دیکھا کرتے تھے کہ ہر ایک پرند سایہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اس مشکل کی خاطر یہ کہانی بنائی گئی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو لوگوں نے کہا پانی کا پتہ جن بتا سکتے ہیں۔ جنوں نے کہا پرند بتا سکتے ہیں، پرندوں نے کہا ہدہد بتا سکتا ہے۔ تب معلوم ہوا کہ ہدہد غائب ہے۔ (ج) اور کہا جاتا ہے کہ ہدہد زمین کے نیچے پانی دیکھ لیا کرتا تھا۔ اور جہاں پانی ہوتا وہاں سے زمین کرید تا، تب وہاں سے پانی نکال لیا جاتا۔ سوال یہ ہے کہ اب کیوں ہدہد کو زمین کے نیچے پانی نظر نہیں آتا اور اگر یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا تو اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر پھر پرند کا محتاج ہی رکھا۔ اب جب تک ہدہد نہ آئے سب لشکر پیاسا مرے۔ یہ ساری مشکلات اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ہدہد سے مراد یہاں پرند ہدہد لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا جو کچھ ذکر یہاں ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ وہ انسان تھا۔ چنانچہ اس کا یہ کہنا کہ میں سبا سے یقینی خبر لایا ہوں اور ان لوگوں پر ایک عورت حاکم ہے اور اس کے پاس سب قسم کے سامان ہیں اور کہ وہ قوم سورج کی پرستار ہے۔ پھر اس کا وعظ کرنا یہ باتیں پرند کی نہیں انسان کے موزوں حال ہیں۔ یہ تمام باتیں علم سے تعلق رکھتی ہیں جو انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے نہ پرندوں کے لیے۔ اگر پرندوں میں بھی اس قسم کا شعور ہوتا کہ وہ ایسا علم حاصل کر سکتے تو وہ بھی انسانوں کی طرح مکلف ہوتے اور ان کی طرف بھی نبی مبعوث ہوتے۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی حالتوں کو تبدیل کر دیا تھا اور پرندوں کو انسانوں والے حواس اور انسانوں والا علم دے دیا تھا تو یہ ﴿لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ [الروم: 30:30] ''اللہ کی پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا۔'' کے خلاف ہے۔ اور پھر اس قسم کے کلام کرنے کے لیے ان کو زبان بھی انسانوں والی دی گئی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ انسان زبان کا علم دوسروں سے حاصل کرتے ہیں۔ ان پرندوں کا معلم کون تھا؟ یہ سب کچی باتیں ہیں۔ طیر وہی نامہ بر پرند ہیں۔ **<u>هُدْهُدَ کسی شخص کا نام ہے</u>**۔ جو اس محکمہ خبر رسانی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی موجودگی جائزہ کے وقت ضروری تھی۔ کیونکہ پرندوں سے خبر رسانی کا کام ہی لیا جاتا تھا۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب پرندوں کو طلب کیا تا کہ سب سامانوں کی حالت سے واقفیت حاصل کریں تو افسر محکمہ کو غائب پایا۔ تو فرمایا ہدہد کہاں ہے؟ اور پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے ہیں۔ فاکس (لومڑ) اور ولف (بھیڑیا) وغیرہ آج مہذب قومیں بھی اپنے نام رکھتی ہیں اور ہندوؤں میں طوطا رام اور مسلمانوں میں شیر اور باز بلکہ شیر باز عام نام ہے۔ عرب میں بھی ایسے نام رکھ لیے جاتے تھے جیسے اسد وغیرہ اور بائبل میں اسلاطین بیسویں باب میں ایک شخص بن ہدو کا ذکر ہے اور ہدو ہدہد سے ملتا جلتا نام ہے۔ اور بلقیس کے باپ کا نام هُدْهَاد لکھا ہے۔ (منتہی الارب) اور لسان العرب میں ہے کہ هُدْهُدَ کو هُدَاهُد بھی لکھا جاتا ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ هُدَاهُد اور هُدُوْ یمن کے قبیلے کا نام ہے۔ (ل) تو یہ کون سی عجیب بات ہے کہ سلیمان کے کسی افسر کا نام ہدہد ہو۔ اور ﴿جِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاَاْذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۱﴾

میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے قتل کر دوں گا، یا میرے پاس کوئی کھلی دلیل لائے۔ (2462)

فَمَكَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ﴿۲۲﴾

سو بہت دیر نہ ٹھہرا (اور آیا) تو کہا میں نے ایک ایسی خبر معلوم کی ہے جس کا تجھے علم نہیں۔ اور میں سبا سے تیرے پاس یقینی خبر لایا ہوں۔ (2463)

بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ﴾ صاف بتاتا ہے کہ یہ محکمہ خبر رسانی کا افسر تھا جو خود سبا سے یقینی خبر لے کر پہنچ گیا۔ ورنہ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف کہا جائے کہ پرند حضرت سلیمان علیہ السلام کے مسخر تھے، دوسری طرف یہ مانا جائے کہ ایک پرند حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم کے بغیر اڑ بھی گیا۔ بھلا حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ میں اسے سخت سزا دوں گا، پرند کی صورت میں بے معنی نہیں ٹھہرتا ہے، کیونکہ جو بن پوچھے اڑ گیا ہے وہ واپس کیوں آئے گا اور یہ جو فرمایا کہ میں اسے نہیں دیکھتا یا کیا وہ غیر حاضر ہے۔ تو مراد یہ ہے کہ کہیں میری نظر سے ہی اوجھل ہے یا سچ مچ غیر حاضر ہی ہے۔

2462- مفسرین کہتے ہیں عذاب شدید سے مراد تھا پر نوچ دینا۔ مگر ایک پرند پر ایک عظیم الشان بادشاہ کی اتنی خفگی اور اس کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کہ اسے سخت ترین سزا دی جائے گی یا اسے قتل کر دیا جائے گا یا وہ کوئی واضح دلیل پیش کرے۔ انسان کی سمجھ سے باہر بات ہے پرند اور واضح دلیل؟ اور دلیل طلب کرنے والے سلیمان بادشاہ، اور پھر بے شمار ہدہدوں میں سے ایک وہی ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کا محکوم تھا یا سارے ہدہد۔ صرف اکیلے کا مسخر ہونا بے معنی ہے۔ اگر سارے ہدہد مسخر تھے تو پانی نکالنے کے لیے ایک ہدہد نہ سہی دوسرے کو بلا لیا ہوتا۔ پھر خفگی کا مطلب ہی کچھ نہ تھا۔

2463- ﴿سَبَاٍ﴾ ایک شہر کا نام ہے جس میں یمن کے قبائل عامہ جمع ہوتے ہیں اور یہ یمن کے اس شہر کا نام ہے جہاں بلقیس تھی جس کو مَأْرِبْ کہا جاتا ہے اور یہ صنعا سے تین رات کے فاصلہ پر ہے۔ (ل)

سبا سے یقینی خبر لانا اس بات کا مؤید ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اسی ملک کی طرف آ رہے تھے۔ اس لیے ان کے افسروں کا فرض تھا کہ وہ یقینی خبر لا کر دیتے کہ وہاں کے معاملات کیسے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے کسی حملہ کی تیاری کی خبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو پہنچی ہے جس کی وجہ سے وہ تیاری کر کے ان کی سرحد پر پہنچ گئے۔ ﴿اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ﴾ یعنی وہ صحیح خبریں جو میں نے اس ملک میں جا کر جمع کی ہیں وہ ابھی تک آپ کو نہیں پہنچیں۔ احاط کے لیے [دیکھو نمبر: 239] وغیرہ۔ ایک پرند یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے دوسرے انسانوں کے متعلق وہ علم حاصل ہے جو خود انسانوں کو حاصل نہیں۔ مفسرین کہتے ہیں اس ہدہد نے جا کر اس ملک کے کسی ہدہد سے یہ باتیں دریافت کر لی تھیں۔ گویا اس زمانہ میں سب ہدہد ہی انسانوں کی طرح واقعات کا علم حاصل کر لیا کرتے تھے۔

اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَۃً تَمۡلِکُہُمۡ وَ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ لَہَا عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۳﴾

میں نے ایک عورت کو ان پر بادشاہی کرتے پایا اور اسے ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا ایک بڑا تخت ہے۔ (2464)

وَجَدۡتُّہَا وَ قَوۡمَہَا یَسۡجُدُوۡنَ لِلشَّمۡسِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ فَہُمۡ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۲۴﴾

میں نے اسے اور اس کی قوم کو اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہوئے پایا اور شیطان نے ان کے عمل انہیں اچھے کر کے دکھائے اور انہیں رستہ سے روک دیا، سو وہ سیدھی راہ پر نہیں چلتے۔

اَلَّا یَسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَ مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۵﴾

کہ وہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ (2465)

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۶﴾ السجدۃ

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بڑے عرش کا رب ہے۔

2464- ﴿اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ﴾ سے مراد سلطنت اور حکومت کے سارے سامان ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدہد کو ان کی فوجوں، سامان جنگ وغیرہ کی بھی خبر مل گئی تھی۔

2465- ﴿الۡخَبۡءَ﴾۔ خَبۡءٌ ہر ایک ذخیرہ کی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو۔ (غ)

ہدہد کا وعظ:

یہ وعظ پرند کا کام نہیں ہوسکتا۔ اسے یہ بھی خبر ہے کہ معبود حقیقی تو خدا ہے مگر انسانوں نے کچھ اور معبود بھی بنا لیے ہیں اور وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ شیطان بھی ہے جو انسانوں کو ورغلاتا ہے اور اعمال بد انہیں اچھے کر کے دکھاتا ہے۔ گویا اسے اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ کا بھی پتہ ہے۔ اور ﴿مَا تُخۡفُوۡنَ﴾ اور ﴿مَا تُعۡلِنُوۡنَ﴾ میں تو صاف انسانوں کو خطاب ہے۔ اور بتایا ہے کہ جس طرح آسمانوں اور زمین کی مخفی قوتوں کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا ہے اسی طرح تمہارے اعمال پر بھی وہ نتائج مترتب کرتا ہے۔

قَالَ سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۲۷﴾

کہا، ہم دیکھیں گے کہ تو سچ بولتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے۔[2466]

اِذۡهَبۡ بِّكِتٰبِىۡ هٰذَا فَاَلۡقِهۡ اِلَيۡهِمۡ ثُمَّ تَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَانۡظُرۡ مَاذَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾

یہ میرا خط لے جا، سو یہ انہیں دے دے۔ پھر ان سے پھر آ اور انتظار کر کہ وہ کیا (جواب) دیتے ہیں۔

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّىۡۤ اُلۡقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

(ملکہ نے) کہا، اے سردارو مجھے ایک معزز خط ملا ہے۔

اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴿۳۰﴾

وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے ہے۔

اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ وَاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾ ع 2 17 17

کہ میرے خلاف سرکشی نہ کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے پاس آجاؤ۔[2467]

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾

(ملکہ نے) کہا اے اہل دربار میرے معاملہ میں مجھے جواب دو۔ میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود (نہ) ہو۔

2466- صادق اور کاذب کے الفاظ انسانوں پر صادق آسکتے ہیں نہ پرندوں پر۔ اگر یہ سچ ہو تو پرندوں کی طرف رسول مبعوث ہونے چاہئیں جو انہیں سیدھی راہ بتائیں۔

2467- ﴿تَعۡلُوۡا﴾۔ [عَلَا فُلَانٌ فُلَانًا] کے معنی ہیں وہ اس پر غالب آ گیا۔ (ل) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلقیس کا ارادہ سلیمان علیہ السلام پر چڑھائی کرنے کا تھا۔ خط کی یہ صورت ﴿اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴾ بتاتی ہے کہ لمبے لمبے **القاب** سب بیہودہ تکلفات ہیں اور خطوط میں سادگی اختیار کرنی چاہیے۔

قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّۃٍ وَّ اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ ۙ وَّ الۡاَمۡرُ اِلَیۡکِ فَانۡظُرِیۡ مَا ذَا تَاۡمُرِیۡنَ ﴿۳۳﴾

انہوں نے کہا ہم قوت والے اور سخت لڑنے والے ہیں۔ اور حکم کرنا تیرے اختیار میں ہے۔ پس دیکھ لے کہ تو کیا حکم کرتی ہے۔

قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡہَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّۃَ اَہۡلِہَاۤ اَذِلَّۃً ۚ وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾

اس نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، اس کو برباد کر دیتے ہیں اور اس کے عزت والے لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور اسی طرح کریں گے۔

وَ اِنِّیۡ مُرۡسِلَۃٌ اِلَیۡہِمۡ بِہَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌۢ بِمَ یَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

اور میں ان کی طرف تحفہ بھیجتی ہو پھر دیکھتی ہوں کہ ایلچی کیا جواب لاتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَیۡمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰہُ خَیۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىکُمۡ ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِہَدِیَّتِکُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ ﴿۳۶﴾

پس جب (ایلچی) سلیمان کے پاس آیا اس نے کہا کیا تم مجھے مال سے مدد دیتے ہو، سو جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے۔ بلکہ تم اپنے تحفہ پر اتراتے ہو۔ (2468)

اِرۡجِعۡ اِلَیۡہِمۡ فَلَنَاۡتِیَنَّہُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا

ان کی طرف لوٹ جا، سو ہم ان پر ایسے لشکر لائیں گے جن کا

2468- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحفہ سے اس نے اپنی بڑائی کا اظہار کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی کچھ تحقیر بھی کی ہے۔ امراء کے مشورہ کا بھی یہی منشا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں سلیمان کی کیا پروا ہے۔ ہم بڑے طاقت والے اور سخت جنگ کرنے والے ہیں۔ جس میں جنگ کی دھمکی موجود تھی۔ تحفہ کیا تھا؟ اس کے مفسرین نے بڑے بڑے عجیب نقشے کھینچے ہیں۔ پانچ سو لونڈیاں لڑکوں کے لباس میں اور پانچ سو لڑکے لونڈیوں کے لباس میں اور پھر اور عجائبات۔ پھر اسی کے مقابل پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تیاری کی وہ عظمت ظاہر کی ہے، یہ سب فرضی خیالات ہیں۔ قرآن کریم نے اگلی آیات میں خود بتا دیا ہے کہ وہ ہدیہ کیا تھا۔ یہ ایک بڑا مرصع تخت تھا جس پر کچھ تصاویر وغیرہ بنی ہوئی تھیں۔

قِبَلَ لَهُمۡ بِهَا وَ لَنُخۡرِجَنَّهُمۡ مِّنۡهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

وہ مقابلہ نہ کرسکیں گے اور ہم انہیں اس سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ خوار ہوں گے۔ (2469)

قَالَ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اَیُّکُمۡ یَاۡتِیۡنِیۡ بِعَرۡشِهَا قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۸﴾

(سلیمانؑ نے) کہا، اے اہل دربار تم میں سے کون میرے پاس اس کا تخت لائے گا، اس سے پہلے کہ وہ میرے پاس فرمانبردار ہو کر آئیں۔ (2470)

قَالَ عِفۡرِیۡتٌ مِّنَ الۡجِنِّ اَنَا اٰتِیۡکَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِکَ ۚ وَ اِنِّیۡ عَلَیۡهِ لَقَوِیٌّ اَمِیۡنٌ ﴿۳۹﴾

جنوں میں سے ایک زبردست نے کہا میں اسے تیرے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے۔ اور میں اس (کے اٹھانے) کی قوت رکھتا ہوں۔ امین ہوں۔ (2471)

2469- ﴿قِبَلَ﴾۔ [قِبَلَ عِنْدِ] کے معنی میں آتا ہے یعنی پاس یا سامنے۔ ﴿فَمَالِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا قِبَلَکَ مُهۡطِعِیۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ [المعارج: 36:70] ''مگر انہیں کیا ہوا جو کافر ہیں تیری طرف دوڑے آرہے ہیں۔'' اور بطور استعارہ مقابلہ کی طاقت پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور [لَا قِبَلَ لِیْ بِکَذَا] کے معنی ہیں میرے لیے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ یہی معنی یہاں ہیں۔ (غ) اگر یہ تحفہ دوستانہ رنگ کا ہوتا اور اس میں اظہار دوستی ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام یہ جواب نہ دیتے۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو پہلے نوٹ میں بیان ہوئی۔

2470- **ملکہ کا تخت حضرت سلیمانؑ کے پاس کس طرح آیا:** درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عزم اور ان کی طاقت کا حال معلوم کر کے ان لوگوں کا ارادۂ جنگ کمزور ہو گیا اور انہوں نے فرمانبرداری اختیار کی اور اپنی فرمانبرداری کے خلوص کا یقین دلانے کے لیے خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کا تخت لانے کے لیے کہا۔ اس کے تخت سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ وہاں جس تخت پر بیٹھ کر وہ حکومت کرتی ہے اور وہ اس کا مال ہے وہ لایا جائے۔ دوسرے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہو کر کیونکر منگوانے کا خیال کر سکتے تھے۔ بلکہ یہ وہی تحفہ ہے جو اس نے بھیجا تھا۔ اسی لیے اسے اس کا تخت کہا ہے۔ اس تحفہ پر آپ ناراض کیوں ہوئے تھے اور اس کو اب منگوانے کی غرض کیا ہے؟ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

2471- ﴿عِفۡرِیۡتٌ﴾۔ عَفَر مٹی کو کہتے ہیں اور عَافَرَہٗ کے معنی ہیں اسے مٹی میں لٹایا اور عِفۡرِیۡتٌ کے معنی سخت اور خبیث ہیں اور جس

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَہٗ قَالَ ہٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ ۫ لِیَبۡلُوَنِیۡۤ ءَاَشۡکُرُ اَمۡ اَکۡفُرُ ؕ وَ مَنۡ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیۡ غَنِیٌّ کَرِیۡمٌ ﴿۴۰﴾

جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا میں تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے اسے تیرے پاس لے آتا ہوں۔ پھر جب اسے اپنے پاس موجود دیکھا، کہا یہ میرے رب کے فضل سے ہے کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ صرف اپنے (بھلے) کے لیے ہی شکر کرتا ہے اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو میرا رب بے نیاز بزرگی والا ہے۔ (2472)

قَالَ نَکِّرُوۡا لَہَا عَرۡشَہَا نَنۡظُرۡ اَتَہۡتَدِیۡۤ اَمۡ تَکُوۡنُ مِنَ الَّذِیۡنَ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۴۱﴾

(سلیمانؑ نے) کہا اس کے لیے اس کے تخت کی صورت بدل دو ہم دیکھیں کہ آیا وہ سیدھے رستہ پر چلتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہو جاتی ہے جو سیدھی راہ پر نہیں چلتے۔ (2473)

طرح شیطان کا لفظ انسان پر بولا جاتا ہے عِفۡرِیۡتٌ بھی بولا جاتا ہے۔ (غ) اور زجاج کا قول ہے کہ عِفۡرِیۡتٌ مردوں میں سے وہ ہے جو خبث اور شدت کے ساتھ کسی معاملہ میں گھس جائے اور اسے کمال کو پہنچائے۔ (ل)

2472- یہاں عفریت کے مقابل پر ایک صاحب علم کا ذکر کیا۔ ﴿عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ﴾ سے ممکن ہے کہ علم دین مراد ہو، مگر بظاہر عام علم ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ معاملہ صرف ایک تخت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے کا ہے کوئی دینی مسئلہ نہیں۔ اور ﴿قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ﴾ کو بعض نے حقیقت پر محمول کیا ہے اور مراد یہ لی ہے کہ آنکھ کھول کر سامنے دیکھے تو قبل اس کے کہ نظر لوٹ آئے اور بعض نے کہا کہ قبل اس کے کہ اتنی دور سے جہاں نظر پہنچے ایک آدمی آ جائے۔ اور مجاہد کا قول قابل ترجیح ہے کہ یہ سرعت میں مبالغہ ہے۔ اور یہاں **قوت اور علم کا مقابلہ** ہے۔ یعنی پہلی آیت میں عِفۡرِیۡتٌ قوت اور جسمانی طاقت کا نمائندہ ہے۔ وہ پھر بھی وقت چاہتا ہے اور صاحب علم شخص گو قوت میں اتنی شدت نہ رکھتا ہو اس کام کو فوراً کر سکتا ہے۔ گویا قوت کے مقابل پر علم بڑی چیز ہے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے آزماتا ہے کہ میں شکر کرتا ہوں کہ ناشکری۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر تخت کی صورت بدلنے میں اگلی آیت میں آتا ہے۔

2473- ﴿نَکِّرُوۡا﴾۔ تَنۡکِیۡر کسی چیز کو ایسا بنا دینا کہ وہ پہچانی نہ جائے۔ اور تَعۡرِیۡف اس کا ایسا بنا دینا کہ وہ پہچانی جائے۔ (غ) اس لیے تَنۡکِیۡر کے معنی تغیر ہیں، یعنی صورت کا بدل دینا۔ (ج)

فَلَمَّا جَآءَتۡ قِیۡلَ اَهٰكَذَا عَرۡشُكِ ؕ قَالَتۡ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوۡتِیۡنَا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهَا وَ كُنَّا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۴۲﴾

سو جب وہ آئی کہا گیا، کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا۔ کہنے لگی گویا کہ یہ وہی ہے اور ہمیں اس سے پہلے علم ہو گیا تھا اور ہم فرمانبردار ہو گئے۔ (2474)

حضرت سلیمانؑ نے تخت کی صورت بدلنے کا حکم دیا:

مفسرین اس کی وجہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ آپ کو کہا گیا تھا کہ بلقیس کا دماغ خراب ہے، تو آپ نے امتحان کے لیے ایسا کیا۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی کا تخت منگوایا گیا تھا اور اس کو معجزہ دکھانا مقصود تھا۔ اب اگر تخت کی صورت بدل دی جائے تو معجزہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں تو صاف خیال گزرے گا کہ اس کے تخت کی مانند دوسرا تخت حضرت سلیمان علیہ السلام نے تیار کرالیا ہے۔ پس تخت کی صورت کا بدل دینا معجزہ دکھانے کے خیال کو باطل کرتا ہے اور امتحان عقل کے لیے صورت تخت کو بدل دینا بھی کوئی عقلمندی کا خیال نہیں۔ اس واقعہ پر کافی روشنی ان باتوں سے پڑتی ہے جو خود قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ اوّل: حضرت سلیمان علیہ السلام پہلے اس تخت کو جو تحفہ کی صورت میں پیش کیا گیا تھا، دیکھ کر ناراض ہوئے ہیں۔ دوم: جب بلقیس کی آمد پر تخت منگوایا ہے تو اسے دیکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتحان ہے کہ میں شکرگزاری اختیار کرتا ہوں یا نہیں۔ سوم: تخت کے تبدیل کرنے کی غرض یہ ہے کہ ملکہ خود اس تبدیلی سے راہ راست کی طرف آتی ہے یا نہیں۔ ان تینوں باتوں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس تخت پر جو ملکہ نے بطور تحفہ بھیجا، کچھ شکلیں بتوں کی یا اور اس قسم کی شکلیں بنی ہوئی تھیں، جنہیں ایک موحد انسان پسند نہ کرسکتا تھا۔ اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ ان شکلوں وغیرہ کو ملیامیٹ کردو اور اسے شکرگزاری کا امتحان اس لیے کہا تھا کہ وہ شکلیں جواہرات وغیرہ سے بنی ہوئی ہوں گی۔ جیسا کہ ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ کی طرف تحفہ ہونے سے ظاہر ہے۔ تو ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شکلیں دور کردی جائیں اور خوبصورتی اور آرائش کی محبت یہ چاہتی تھی کہ وہ اسی طرح بنی رہیں اور ملکہ کا اس سے ہدایت پانا یوں تھا کہ اسے معلوم ہو جاتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام مال دنیا کی پروا ایمان کے مقابلہ میں کچھ نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ وہ معبود کس طرح ہوسکتا ہے جسے ایک انسان بنائے اور دوسرا فنا کردے۔ پس جب قرآن کریم خود اس واقعہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے اور بات بھی یہی انبیاء کی شان کے لائق ہے کہ وہ توحید کی ہتک کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے، تو اور قصے بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگلی آیت بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ ﴿اَهٰكَذَا عَرۡشُكِ﴾ کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا؟ اگر اسی کا تخت منگوایا ہوا ہوتا تو سوال یوں ہوتا ﴿اَهٰذَا عَرۡشُكِ﴾ کیا یہ تیرا تخت ہے؟ هٰكَذَا کہہ کر صاف بتادیا کہ اس کو توجہ دلانا تھا کہ یوں تو تیرا ہی بھیجا ہوا تخت ہے مگر کیا جب تو نے بھیجا تھا تو یہ ایسا ہی تھا؟ تاکہ وہ غور کرے کہ اس میں کیا تبدیلی کردی گئی ہے اور اس تبدیلی کی طرف اس کی توجہ ہو۔

2474- **بلقیس کو اس کی ناپسندیدگی کا علم ہو جانا:** ﴿اَهٰكَذَا عَرۡشُكِ﴾ پر دیکھو پچھلا نوٹ۔ اور اس کا جواب گویا کہ ایسا ہی بتاتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا۔ مگر ﴿اُوۡتِیۡنَا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهَا﴾ سے کیا مراد ہے؟ ابن جریر نے تو اسے حضرت سلیمان علیہ السلام

وَ صَدَّهَا مَا كَانَتۡ تَّعۡبُدُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتۡ مِنۡ قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ ﴿۴۳﴾

اور اسے اس نے روک رکھا جس کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتی تھی، وہ کافر قوم سے تھی۔ (2475)

قِيۡلَ لَهَا ادۡخُلِى الصَّرۡحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتۡهُ حَسِبَتۡهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَيۡهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ ؕ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّىۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَيۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۴﴾ ع 3 13 18

اسے کہا گیا محل میں داخل ہو جا، سو جب اسے دیکھا اسے بہت گہرا پانی سمجھا اور گھبرائی۔ (سلیمانؑ نے) کہا، یہ محل ہے جو شیشوں سے جڑا گیا ہے۔ (اس نے) کہا میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ جہانوں کے رب پر ایمان لائی۔ (2476)

کا قول قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق روایات بیان کی ہیں اور بھی کئی مفسرین اس طرف گئے ہیں۔ اور بعض مفسرین نے اسے ملکہ کا قول قرار دے کر جیسا کہ ظاہر ہے یہ مطلب لیا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا علم اس معجزہ کے دیکھنے سے پہلے تھا جو بالکل غلط ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا علم ہوتا تو بت پرست کیوں رہتے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب اس نے اپنے بتوں وغیرہ کی شکلوں کو اس پر نہ پایا تو اس نے کہا کہ آپ نے ان کو ناپسند کر کے دور کرا دیا ہے اور آپ کی ناپسندیدگی کا علم ہمیں پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ ایلچی نے جا کر سب کچھ بتا دیا ہوگا کہ کس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس تحفہ کو ناپسند کیا۔ ﴿بَلۡ اَنۡتُمۡ بِهَدِيَّتِكُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ﴾ میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے اظہار ناپسندیدگی اس کے سامنے کر دیا تھا۔ قَبۡلِهَا میں ضمیر اس تبدیلی کی حالت کی طرف ہے اور ﴿كُنَّا مُسۡلِمِيۡنَ﴾ کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں یعنی ہم نے بت پرستی کو چھوڑ کر توحید اختیار کر لی ہے یا یہ کہ سرکشی کو چھوڑ کر فرمانبرداری اختیار کر لی ہے۔ اگلی دونوں آیات کے مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے میں دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ ابھی ﴿اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَيۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ آگے آتا ہے۔

2475- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب تک ایمان نہیں لائی بلکہ عبادت ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ نے اسے ابھی تک سلیمان علیہ السلام پر ایمان لانے سے روک رکھا تھا۔ اور بعض نے یوں معنی کیے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے اسے ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ کی عبادت سے روک دیا۔ لیکن اگر دل میں ایمان نہ ہو تو زبردستی سے روک دینا اصول مذہب کے خلاف ہے۔

2476- ﴿الصَّرۡحَ﴾۔ صَرَح اور صَرِیح وہ شے ہے جو ہر چیز سے خالص کی گئی ہو اور صَرۡح بلند مکان ہے جو مزین کیا گیا ہو۔ گویا کہ وہ ہر آلودگی سے پاک ہے۔ (غ) ﴿ابۡنِ لِىۡ صَرۡحًا﴾ [المؤمن: 36:40] ''میرے لیے ایک بلند محل بنا۔''

﴿لُجَّةً﴾۔ [دیکھو نمبر: 2288] [لُجَّةُ الْبَحْرِ] وہ ہے جس کی گہرائی کا احاطہ نہ ہو سکے اور [لُجَّةُ الْمَآءُ] بہت بڑے پانی کو کہتے ہیں۔ (ل)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اور ہم نے ہی ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ

﴿كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا﴾۔ ساق وہ ہے جو پاؤں اور گھٹنے کے درمیان ہو یعنی پنڈلی۔اس کی جمع سوق ہے۔﴿فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ۝﴾[صٓ: 33:38] ''تب وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔'' اور لغت میں ساق امر شدید کو بھی کہتے ہیں۔اور قرآن کریم میں ہے ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾[القلم: 42:68] ''جس دن شدت ظاہر ہوگی۔'' اور حدیث قیامت میں ہے[يُكْشَفُ عَنْ سَاقِهٖ]۔تو یہاں ساق سے مراد امر شدید ہی ہے اور اس کا کشف شدت امر میں مثال ہے۔جیسا کہ بخیل کو کہا جاتا ہے [يَدَهٗ مَغْلُوْلَةٌ] اور نہ وہاں ہاتھ ہوتا ہے نہ اس کا باندھنا، اور یہ شدت بخل میں مثال ہے۔اسی طرح یہاں نہ پنڈلی ہے اور نہ اس کا کھولنا اور اس کا اصل یہ ہے کہ انسان جب ایک امر شدید میں مبتلا ہو جائے تو کہا جاتا ہے [شَمَّرَ سَاعِدِهٖ وَكَشَفَ عَنْ سَاقِهٖ] گویا اس امر عظیم کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ابن سیدہ نے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ میں کہا ہے کہ اس سے مراد شدت امر ہے۔جیسا کہ کہتے ہیں[قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰى سَاقٍ] اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ساق سے جب شدت مراد ہو تو اسے پنڈلی سے تشبیہ ہوتی ہے۔کیونکہ پنڈلی سارے جسم کو اٹھاتی ہے اور اسے چلاتی ہے۔(ل)

﴿مُمَرَّدٌ﴾۔ مَرَدٌ کے لیے[دیکھو نمبر: 734] اور مُمَرَّدٌ سے مراد ہے صاف اور ہموار کیا ہوا۔(غ)

﴿قَوَارِيْرَ﴾۔ قَارُوْرَةٌ کی جمع ہے یعنی شیشہ۔﴿قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ﴾[الدھر: 16:76] ''شیشے بھی چاندی کے۔''(غ)

بلقیس کی پنڈلیوں پر بالوں کا قصہ:

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر انہیں خبر ملی کہ اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں تو انہوں نے اس بات کی تحقیق کے لیے ایک عظیم الشان شیش محل بنایا اور اس کے نیچے پانی چلایا اور بلقیس کو اس میں داخل ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے پانی سمجھ کر اپنی پنڈلیاں کھول دیں۔ایک نبی ہو کر محض ایک عورت کی پنڈلیاں دیکھنے کے لیے اتنا خرچ اور ایسی تجویزیں کریں یہ سمجھ سے باہر بات ہے۔اور قرآن کریم کے الفاظ اس کی تردید کرتے ہیں۔اس لیے کہ قرآن کریم میں صاف ہے ﴿حَسِبَتْهُ لُجَّةً﴾۔اسے لُجَّةً سمجھا اور لُجَّةً اس پانی کو کہتے ہیں کہ جس کی گہرائی کا احاطہ نہ ہو سکے۔تو اس میں پنڈلیاں کھول کر گزرنے کا خیال کس طرح آ سکتا تھا۔ہاں یوں ہوتا کہ سارے کپڑے اتار دیئے تو خیال ہو سکتا تھا کہ تیر کر پار ہونے کے لیے ایسا کیا ہوگا۔مگر اتنے گہرے پانی کے لیے پنڈلیاں کھولنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا۔اور پھر اس سے سبق کیا ملتا ہے، جس کی وجہ سے قرآن کریم اس بات کو بیان کرتا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ [كَشَفُ عَنْ سَاقٍ] کا غلط مفہوم لے کر اس پر سارے قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔حالانکہ [كَشَفُ عَنْ سَاقٍ] سے جیسا کہ اوپر لسان العرب سے دکھایا گیا ہے پنڈلیوں کا کھولنا مراد نہیں، بلکہ ایک شدید امر کا پیش آنا ہے جس سے انسان گھبرا جائے۔اصل یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک تخت بھیج کر جس پر مشرکانہ تصاویر وغیرہ بنی ہوئی تھیں گویا شرک کی دعوت دی تھی۔اس کے مقابل پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اس کی عبادت میں ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی غلطی کی طرف اس طرح پر توجہ دلائی ہے۔حضرت

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ فَاِذَا ہُمۡ فَرِیۡقٰنِ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾

اللہ کی عبادت کرو۔ تو وہ دو فریق ہو کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ (2477)

قَالَ یٰقَوۡمِ لِمَ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبۡلَ الۡحَسَنَۃِ ۚ لَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۴۶﴾

(اس نے) کہا، اے میری قوم! کیوں تم بھلائی سے پہلے دکھ کو جلدی مانگتے ہو۔ کیوں تم اللہ سے استغفار نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

قَالُوا اطَّیَّرۡنَا بِکَ وَ بِمَنۡ مَّعَکَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ تُفۡتَنُوۡنَ ﴿۴۷﴾

انہوں نے کہا ہمیں تیری وجہ سے اور ان کی وجہ سے جو تیرے ساتھ ہیں مصیبت ہی پہنچتی ہے۔ اس نے کہا تمہاری مصیبت اللہ کی طرف سے ہے۔ بلکہ تم لوگ ہو جو آزمائے جاتے ہو۔

وَ کَانَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ تِسۡعَۃُ رَہۡطٍ

اور شہر میں نو شخص تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے

سلیمان علیہ السلام بادشاہ تھے اور ان کے محلات بھی تھے (وہ کامل نمونہ کہ بادشاہ ہو کر گارے اور کھجور کی بنی ہوئی جھونپڑی میں گزارہ کریں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہی مقدر تھا) انہوں نے ایک تصویری رنگ میں ملکہ پر اس کی غلطی کا اظہار کیا۔ یعنی نہایت مصفا شیشوں کے نیچے سے پانی چلایا۔ ملکہ نے ان شیشوں کو پانی سمجھ لیا۔ وہ پرستار سورج تھی، سورج کی طاقت بڑی نظر آتی تھی، مگر حقیقی طاقت جو اس کے نیچے کام کر رہی ہے **وہ الٰہی طاقت ہے۔ نظر غائر سے کام نہ لینے والے** خود سورج کو ہی الٰہی طاقت سمجھ لیتے ہیں۔ پس اس تصویری زبان میں کہ شیشہ کو پانی نہ سمجھو، یہ سمجھایا کہ سورج کو خدا نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ ایک ہے یہ سب چیزیں اس کی طاقت اور قوت کے مظاہر ہیں۔ مظاہر قدرت کو خدا سمجھنا غلطی ہے اس سے ہر انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا۔ ورنہ کسی عورت کی پنڈلیوں پر بالوں کا ہونا یا نہ ہونا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس کے ذکر کی خدا کے کلام میں ضرورت ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تصویری زبان میں کسی حقیقت کا روشن کرنا جائز امر ہے۔ اس لیے **تصاویر کے ساتھ علم کا بڑھانا ممنوع نہیں۔**

2477- اس رکوع میں صرف حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ ان دو پیغمبروں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی قوموں کی بستیاں اس رستہ پر ہیں جو مکہ سے شام کو جاتا تھا اور عرب کے لوگ جو شام سے تجارت کرتے تھے ان بستیوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔

يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

انہوں نے کہا اللہ کی قسم کھاؤ کہ ضرور ہم اس پر اور اس کے اہل پر رات کے وقت حملہ کریں گے۔ پھر ہم اس کے ولی کو کہہ دیں گے ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔ (2478)

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور انہوں نے مخفی تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک مخفی تدبیر کی اور انہیں خبر نہ تھی۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾

سو دیکھ ان کی تدبیر کا انجام کیسا ہوا کہ ہم نے انہیں اور ان کی قوم سب کو تباہ کر دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾

سو یہ ان کے گھر ویران پڑے ہیں اس لیے کہ انہوں نے ظلم کیا۔ اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو جانتے ہیں۔

وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور ہم نے انہیں نجات دی جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے تھے۔

2478- اس سے اور اس سے پہلی آیت میں حضرت صالح علیہ السلام کے ذکر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعدا اور ان کے منصوبوں کا ذکر ہے۔ ﴿تِسْعَةُ رَهْطٍ﴾ سے مراد نو بڑے بڑے آدمی ہیں جن کے ساتھ جتھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بڑے دشمن نو ہی تھے، جن میں سے آٹھ بدر میں مارے گئے اور نواں ابولہب بدر کی شکست کا حال سن کر مر گیا۔ یعنی ① ابوجہل، ② مطعم بن عدی، ③ شیبہ بن ربیعہ، ④ عتبہ بن ربیعہ، ⑤ ولید بن عتبہ، ⑥ امیہ بن خلف، ⑦ نضر بن الحرث، ⑧ عقبہ بن ابی معیط، ⑨ ابولہب۔ اور رات کے وقت حملہ کرنے کا مشورہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا یہاں حضرت صالح علیہ السلام کے ذکر میں ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آخری فیصلہ دار الندوہ میں یہی کیا گیا تھا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا جائے اور جب رات کو آپ نکلیں جیسا کہ تہجد کے لیے آپ کی نکلنے کی عادت تھی تو اس وقت چند کس یک مرتبہ حملہ کریں تا کہ کسی ایک پر الزام قتل نہ آئے۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝٥٤

اور لوط کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم بے حیائی کے کام کرتے ہو۔ حالانکہ تم دیکھتے ہو۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝٥٥

کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو۔ بلکہ تم جاہل قوم ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝٥٦

سو اس کی قوم کا جواب کچھ نہ تھا مگر یہ کہ انہوں نے کہا لوط کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا چاہتے ہیں۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝٥٧

سو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات دی، مگر اس کی عورت جسے ہم نے پیچھے رہنے والوں میں مقدر کیا تھا۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝٥٨ ع 4 14 19

اور ہم نے ان پر ایک مینہ برسایا۔ تو کیا ہی برا ان کا مینہ تھا جو ڈرائے گئے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝٥٩

کہہ، سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور اس کے بندوں پر سلامتی ہے جنہیں اس نے چنا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ شریک بناتے ہیں۔ (2479)

2479- ﴿آٰللّٰهُ﴾ اصل میں ءَاَللّٰهُ ہے اور اَمَّا اصل میں اَمْ مَا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کے اصطفا کا ذکر فرمایا ہے وہ اصحاب رسول اللہ ﷺ ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ (ج) اور ظاہر ہے کہ یہاں سلامتی کا وعدہ ہے یعنی دشمن ان کو تباہ نہیں کر سکتے اور ان کے مقابل پر ساتھ ہی مشرکوں کا ذکر بھی یہی بتاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کا اصطفا بھی انبیاء کے رنگ میں تھا۔ اس لیے کہ ان سے کام بھی وہی لیا گیا جو انبیاء سے لیا جاتا تھا۔